جنت کی چاہت میں
SohniDigest.Com
حسیب اشرف

ناول
حسیب اشرف

جنت کی چاہت میں

سوات کی خوبصورت وادیاں دلکش موسم اور یہ حسین رات خدا کی قدرت کا منفرد نظارا پیش کر رہے تھے۔ فوجی کیمپ میں ہونیوالے ہلے گلے نے اور اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔آج کیمپ میں جشن کا سا سماں تھا ۔میجر سمیت تمام یونٹ اس وقت جشن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کچھ سپاہی ناچ رہے تھے اور کچھ سماں باندھنے کے لیے جو برتن ہاتھ میں آیا وہی بجا کر مزہ دوبالا کر رہے تھے اور باقی ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے جشن کا مزہ لے رہے تھے۔

”میجر صاحب آج تو بہت خوشی کا دن ہے آپ بھی ہمارے ساتھ مل کر دو لٹکے جھٹکے لگا لیں“ کیپٹن زوہیب نے میجر صاحب کو پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں کیپٹن زوہیب میں یہی ٹھیک ہوں یہ لٹکے جھٹکے میرے بس کی بات نہیں ہے“ میجر صاحب نے فوراً ہی معذرت کر لی۔

”میجر صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ بڑے کڑک افسر ہیں لیکن اس وقت ہم سب دوستوں کی طرح اپنی کامیابی کا مزہ لے رہے ہیں تو اس لیے اپنا کڑک پن چھوڑیے اور آ جائیں میدان میں“ کیپٹن صہیب نے بھی

منانے کی کوشش کی۔

''کڑک پن کی بات نہیں ہے یار میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے واقعی ڈانس کرنا نہیں آتا تم لوگ ایسا کرو کہ یہ ہمارے آج کے ہیرو لیفٹیننٹ سکھوندر سنگھ کو اُٹھاؤ سب سے زیادہ شکار اسی نے کیے ہیں تو سب سے زیادہ لٹکے جھٹکے بھی اسی کے بنتے ہیں'' میجر نے سکھوندر سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکھوندر سنگھ اس پوری بٹالین میں واحد سردار تھا اور سب اُسے پیار سے شُکھی کہتے تھے۔

''اوئے یہ دیکھو اپنا شُکھی ......شکار کے وقت تو بڑا آگے آگے ہو کر شکار کر رہا تھا اور اب دیکھو کیسے لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے'' کیپٹن صہیب نے طعنہ مارا جس پر پوری پلٹن نے قہقہ لگایا۔

''اوہ کیپٹن صاحب تُسی ایک سردار نوں للکار رہے ہو اوئے ایک سردار نہ ہی لڑائی توں گھبراندا اے اور نہ ہی ڈانس توں'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھا تو لشکر نے تالیاں بجا کر داد دی۔

''اوئے جوانو......اپنے ہتھ زور نال چلاؤ میوزک جنا تیز ہوئے گا جٹ اونا ای جوش نال نچے گا'' وہ برتن بجانے والے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

''فکر نہ کرو سردار جی ہماری طرف سے آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا'' اس کے ساتھ ہی سکھوندر سنگھ کا بھنگڑا اور مولا بخش کے برتنوں کی تھاپ کے درمیاں نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

رات کی خاموشی کی وجہ سے اُن کے شور وغل کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی لیکن وہ بے خوف وخطر جشن میں مصروف تھے کیونکہ آج صبح ہی اُنھوں نے دہشتگردوں کے ٹھکانے پر دھاوا بول دیا تھا جس کے نتیجے میں تیس دہشتگرد مارے گئے اور سب سے زیادہ دہشتگرد مارنے کا شرف سکھوندر سنگھ کو ملا تھا۔

''آدھے گھنٹے بعد جب تھکن کے مارے بے سُدھ ہو کر گر گیا تو سب نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا'' اُس نے بھی خوب داد وصول کی۔

''میجر صاحب بات کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھے تو ایک دم خاموشی سی چھا گئی''۔

''مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ آج اللہ تعالیٰ کہ فضل وکرم سے ہم نے جو تیس دہشتگردوں کو جہنم رسید کیا ہے اُس کے لیے مجھے کرنل جرنل سے لے کر آرمی چیف کی طرف سے مبارکباد کے پیغامات موصول

ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے لیکن یہ بات ہرگز نہ سوچیے کہ ہم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں جب تک اس ملک میں ایک بھی دہشتگرد زندہ ہے ہم چین سے نہیں بیٹھے گے ہم آخری دہشتگرد کے خاتمے تک اپنی لڑائی جاری رکھیں گے'' میجر نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

''انشاءاللہ جاری رکھیں گے'' سب نے اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔

''میں سلام پیش کرتا ہوں آپ لوگوں کے جذبے کو جس طرح آپ نے آگے بڑھ کر دہشتگردوں کا مقابلہ کیا اور اُن کے گھر میں گھُس کر اُن کو نیست و نابود کیا اور آج اُن کے ٹھکانے کہ اُوپر اپنا کیمپ لگا کر بیٹھے ہیں بے شک یہی کام پاک فوج کہ شایان شان ہے''۔

''سکھوندر سنگھ تم پر تمھارا خاندان تمھاری پوری قوم ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان فخر کر رہا ہے اور مجھے بھی فخر ہے اپنی پوری ٹیم پر اور خاص طور پر کیپٹن زوہیب کیپٹن صہیب اور کیپٹن سکھوندر سنگھ پر'' میجر صاحب سکھوندر کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میجر صاحب میں کیپٹن نہیں بلکہ لیفٹیننٹ ہوں'' اُس نے میجر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''سکھوندر سنگھ تم لیفٹیننٹ تھے اب کیپٹن ہو مجھے ابھی ابھی میسج ملا ہے کہ تمھیں کیپٹن کے رینک پر ترقی دے دی گئی ہے اور بہت جلد تمھارے اعزاز میں اعشائیہ بھی رکھا جائے گا''۔

''بہت مبارکاں سردار جی......'' پوری بٹالین نے خوشی سے شور مچایا۔

''بہت شکریہ میجر صاحب......اعشائیہ تو تب ہو گا جب ہم واپس جائیں گے لیکن یہ جو دہشتگردوں کے ککڑ ہمارے ہتھ لگے ہیں ان کا کیا کریں''۔

''یہ تمھارے لیے مال غنیمت ہے اس کا جو چاہے کرو'' میجر صاحب ایک پل کے لیے مسکرائے اور اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔

☆......☆......☆

''یار سُکھی مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ میرے پہرہ دینے کی باری اتنی جلدی کیوں آجاتی ہے'' زوہیب نے سکھوندر سے شکوہ کرتے ہوئے کہا جو اُس کے ساتھ پہرہ دے رہا تھا۔

”میری واری وی تے تیرے نال ای آندی اے“ اُس نے اپنے محسوس سے انداز میں کہا۔

”یار تجھے کتنی بار سمجھایا ہے ہر وقت پنجابی نہ بولا کر مجھے سمجھ نہیں آتی“ اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

”سوری یار اپنے گھر میں اور پنڈ میں ہر وقت پنجابی بول بول کر عادت سی ہوگئی ہے“۔

”اچھا یہ بتا کہ گھر والوں کو بتا دیا اپنی ترقی کے بارے میں“ اُسے تجسس ہوا۔

”نہیں یار جب سے ادھر آئے ہیں کسی سے کوئی رابطہ ہی نہیں ایتھے سگنل ہی نہیں آندے یار“ اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”یار سُکھی دو دن ہو گئے ہیں یہاں رُکے ہوئے میجر صاحب آگے بڑھنے کا سگنل کیوں نہیں دے رہے“۔

”تو اچھا ہی ہے نہ یار یہ جگہ بہت ہی خوبصورت ہے اور یہاں کے ککڑ بھی“ اُس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یار تجھے یہ جگہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اچھی لگتی ہے یا مرغوں کی وجہ سے“ اُس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے سکھوندر کی طرف دیکھا“۔

”یار مرغوں سے یاد آیا کہ میں نے تو سنا تھا یہ دہشتگرد نوجوان لڑکوں کو جنت کا لالچ دے کر دہشتگردی کے لیے مائل کرتے ہیں لیکن یہاں جتنے ککڑ ہیں مجھے تو لگتا ہے وہ ککڑوں کا لالچ دے کر دہشتگردی کرواتے تھے“۔

”ہاں تو کچھ تیری طرح پےٹو بھی تو ہوتے ہیں“ اُس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”اوئے کی......تو مینوں پےٹو کہیا ای“ سکھوندر کو غصہ آ گیا تھا۔

”مذاق کر رہا ہوں یار............اچھا یہ بتا تیرا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے“ اُس نے بات کو گول کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ یار میری شادی تو طے ہو چکی ہے بس چھٹی ملنے کا انتظار ہے اس بار چھٹی جاؤں گا تو شادی کر کہ ہی واپس آؤں گا“۔

”کیا بات ہے تیری تو لائف سیٹ ہے یار“ اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے سکھی کو دیکھا۔

”میری چھوڑ یہ بتا کہ تیری کہیں گل بات چل رہی ہے کہ نہیں“۔

”نہیں یار کوشش تو بہت کی لیکن آج تک کوئی ملی نہیں پتا نہیں کب آئے گی میرے خوابوں کی شہزادی“ اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کہ آ گئی“۔

”کیا بات کر رہا ہے......کہاں ہے“ وہ سکھوندر کی طرف متوجہ ہوا۔

”اوہ ویکھ یار“ اُس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا ایک بُرقعہ پہنے ہوئے لڑکی بھاگتی ہوئی اُن کی طرف آ رہی تھی۔

”یار اے کوئی چڑیل تے نہیں؟“۔

”چڑیل ہوتی تو اُڑ کہ آتی بھاگ کہ نہیں“ زوہیب نے اپنا دماغ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”ابے کہیں کوئی دہشتگرد تو نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پاس آ کر خود کو بم سے اُڑا لے“ کیپٹن زوہیب کو شعبہ ہوا۔

”تے فیر گولی چلا دوں“۔

”نہیں یار اگر واقعی میں کوئی عورت ہوئی تو......ہم تو جنگ کی حالت میں بھی عورتوں بچوں اور بزرگوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تو صرف شک کی خالت میں کیسے گولی چلا سکتے ہیں“ اُسے اپنی تعلیمات بھی یاد تھی۔

”لیکن اگر اُس نے خود کو بم سے اُڑا لیا تو ہمارے اتنے سارے سپاہی شہید ہو جائیں گے“ اچانک اُس کے دماغ میں ہلچل ہوئی۔

”وہ قریب آ رہی ہے جلدی سوچ کی کرنا ای یار“ جوں جوں وہ قریب آ رہی تھی ان کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔

”دیکھ یار میں پہلے ہی بہت کنفیوز ہوں یہ اُردو اور پنجابی مکس کر کے مجھے اور کنفیوز نہ کر“ اُس نے سکھوندر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ایسا کرتے ہیں یار اس سے پہلے کہ وہ ہمارے کیمپ کہ قریب پہنچ جائے ہم اُس کے پاس پہنچ جاتے ہیں پھر اگر بُرقعے میں واقعی دہشتگرد ہوا اور اُس نے اپنے آپ کو بم سے اُڑا لیا تو صرف ہم دونوں ہی مریں

گے'' کیپٹن زوہیب کو اور کچھ نہیں سوجا۔

''تو چل پھر انتظار کس کا ہے واہے گرو جی دا خالصہ واہے گرو جی دی فتح......''۔

''یا اللہ......میرے تمام گناہ معاف فرما اور میری شہادت قبول فرما'' اُنھوں نے بھی اپنے مخصوص نعرے لگائے اور اُس عورت کی طرف بھاگنا شروع کر دیا اور کیمپ سے کچھ دور جا کر بالکل اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''خبردار اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس بندوق کا سارا بارود تمھارے جسم کے آر پار ہوگا'' ذوہیب نے اپنی بندوق اُس پر تان لی۔

''کون ہو تم اپنا نقاب ہٹاؤ'' سکھوندر نے ذرا سخت انداز سے کہا۔

اُس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا تو زوہیب کی نظر اُس کے چہرے پر جم سی گئی۔

''اوہ تیری......ابے یہ تو وہی ہے'' اُس نے سکھوندر کے کان میں سرگوشی کی۔

''کون ہے......تو اس کو جانتا ہے'' سکھوندر کو تجسس ہوا۔

''ابے میرے خوابوں کی شہزادی''۔

''دیکھئے مجھے مدد کی ضرورت ہے'' اُس نے جب اُن دونوں کو آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار بول پڑی۔

''کک......کون ہیں آپ؟'' اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے آپ کے سپہ سالار سے ملنا ہے'' اُس لڑکی نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

''سپہ سالار......؟'' سکھوندر کو اُس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''ہمارے سپہ سالار آرمی چیف ہیں اور وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں'' کیپٹن زوہیب نے جواب دیا۔

''مجھے آپ کی اس یونٹ کے سپہ سالار سے ملنا ہے'' اُس نے اپنی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے رات کے بارہ بج چکے ہیں اس وقت ہم میجر صاحب کو نہیں اُٹھا سکتے آپ ہمیں بتائیں کہ ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں''۔

”بھائی پلیز میری ملاقات اپنے سپہ سالار سے کروا دیں میں بہت بڑی مشکل میں ہوں اور میری مشکل صرف وہی حل کر سکتے ہیں“ اُس نے سکھوندر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے ہم کیسے آپ کو اُن سے ملوا سکتے ہیں ہم تو آپ کا نام بھی نہیں جانتے“ زوہیب نے بہانے سے نام جاننے کی کوشش کی۔

میرا نام عائشہ گل ہے اب پلیز مجھے اُن سے ملوا دو“۔

”اوہ بہن جی آپ سمجھنے کی کوشش کرو ہم اس وقت میجر صاحب کو نہیں اُٹھا سکتے اور ویسے بھی ہم اُنھیں کیا کہیں گے کہ آپ کس بارے میں بات کرنے......“۔

”دہشتگردوں کے بارے میں“ اُس نے تیزی سے اُسکی بات کاٹ کر اپنی بات مکمل کی۔

معصوم سے چہرے والی لڑکی کے منہ سے دہشتگردوں کا نام سُن کر دونوں ہکے بکے رہ گئے۔

☆......☆......☆

”میجر صاحب“ اُس نے خیمے کے دروازے پر آ کر آواز دی تو میجر صاحب ایک آواز سے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے وہ پہلے ہی تیار تھے۔

”کیا ہوا زوہیب سب خیریت تو ہے“ میجر صاحب نے زوہیب سے پوچھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑھی ہوئی تھیں۔

”اس وقت پریشان کرنے کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن باہر ایک لڑکی آئی ہے وہ بہت گھبرائی ہوئی ہے اور صرف آپ سے ہی بات کرنا چاہتی ہے“۔

”لڑکی...... یہاں اور اس وقت“ میجر صاحب کے چہرے پر حیرت عیاں تھی۔

”جی سر شکل سے وہ قبائلی لڑکی لگتی ہے اور وہ دہشتگردوں کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہے“۔

”یاں تو وہ واقعی کسی بہت بڑی مشکل میں ہے یا تو یہ کوئی بہت بڑی سازش ہے“ میجر صاحب کے دماغ میں ہلچل ہوئی۔

”سر ہم نے اُس سے پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ صرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہے“ زوہیب نے

اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم چلو میں آتا ہوں'' میجر صاحب نے اپنا یونیفارم زیب تن کیا اور خیمے سے باہر آ گئے۔

''کہاں ہے وہ لڑکی......''؟۔

''سر ہم نے اُسے کیمپ کے باہر روک کر رکھا ہے''۔

''ٹھیک ہے چلو دیکھتے ہیں''۔ وہ لوگ وہاں پہنچے تو وہ لڑکی سکھوندر کے پاس کھڑی تھی اب اُس کے چہرے پر گھبراہٹ قدرے کم تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ پاک فوج کے حصار میں ہیں۔

''لو پہن جی یہ رہے ہمارے سپہ سالار میجر خالد صاحب'' میجر صاحب وہاں آئے تو سکھوندر نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''السلام وعلیکم سر''۔

''واعلیکم السلام......بی بی کون ہیں آپ اور اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہیں''۔

''سر میرا نام عائشہ گل ہے اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے'' اُس نے اپنا تعارف کروایا۔

''ہم آپ کی مدد ضرور کریں گے لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ یہاں ہیں''۔

''سر میں نے سُنا تھا کہ آپ لوگ اس علاقے میں آپریشن کر رہے ہیں لیکن آپ کس سمت میں ہیں یہ اندازہ نہیں تھا اس لیے میں پچھلے چار دن سے روز رات کو دہشتگردوں سے چھپتے چھپاتے آپ کی تلاش میں نکلتی ہوں اور آج بڑی مشکل سے یہاں پہنچی ہوں'' اُس نے تمام احوال سناتے ہوئے کہا۔

''بی بی اس وقت آپ پاک فوج کی حفاظت میں ہیں اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں جو بھی کہنا ہے بے فکر ہو کر کہیے''۔

''سر میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں'' اُس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''کیا......''؟ میجر صاحب کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''یہ کیا مذاق ہے بی بی......آپ پتا نہیں کہاں سے اتنی رات کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہیں صرف مجھے ایک کہانی سنانے کے لیے'' میجر صاحب کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"سر یہ کہانی کوئی افسانوی یا رومانوی کہانی نہیں ہے"۔

"میرے خیال سے آپ ہمارے ساتھ کوئی مذاق کر رہی ہیں پہلے آپ نے کہا کہ آپ دہشتگردوں کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہیں اور اب آپ کہانی سنانا چاہتی ہیں"۔

"سر یہ کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتی ہوں یہ اُنھی دہشتگردوں کی کہانی ہے" اُس نے مزید وضاحت بیان کی۔

"ہر دہشتگرد کی ایک ہی کہانی ہوتی ہے اس لیے ہمیں اُن کی کہانیاں سننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اگر آپ کے پاس اُن کے ٹھکانے کہ متعلق کوئی معلومات ہے تو آپ ہمیں وہ فراہم کرسکتی ہیں ورنہ آپ جاسکتی ہیں" میجر صاحب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"سر میں جانتی ہوں کہ وہ دہشتگرد کہاں چھپے ہوئے ہیں خدارا آپ ایک بار میری کہانی سُن لیجیے اُس کہ بعد میں خود آپ کو وہاں تک لے جاؤں گی" اُس نے میجر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیا جانتی ہیں آپ دہشتگردوں کے بارے میں"۔

"سر میں دہشتگردوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں لیکن جب تک آپ میری کہانی نہیں سُن لیتے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی"۔

"بی بی آخر آپ مجھے یہ کہانی کیوں سنانا چاہتی ہیں" میجر صاحب نے معنی خیز نظروں سے اُسکی طرف دیکھا۔

"کیونکہ میں اُن دہشتگردوں کو بچانا چاہتی ہوں"۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دہشتگرد ہیں" وہ اس وقت میجر صاحب کی سوالیہ نگاہوں کے حسار میں تھی۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ دہشتگرد ہیں یا مجاہد اسی لیے تو میں آپ کو یہ کہانی سنانا چاہتی ہوں تا کہ آپ مجھے بتا سکیں کہ وہ کیا ہیں"۔

"ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کی کہانی سننے کے لیے تیار ہوں"۔

"کیپٹن زوہیب وہ میدان میں جہاں آگ جل رہی ہے وہاں دو کرسیاں لگا دو" میجر صاحب کیپٹن

زوہیب کی طرف متوجہ ہوئے۔

کیپٹن زوہیب نے آگ کے قریب دو کرسیاں رکھ دی اور واپس پہرہ دینے آ گیا۔

''ویسے کون ہیں یہ دہشتگرد جن کی کہانی آپ مجھے سنانا چاہتی ہیں''میجر صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اُن میں سے ایک میرا شوہر ہے اور دوسرا میرا بھائی......''۔

☆......☆......☆

آدھی رات کو جب آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اُس نے اُٹھ کر سامنے والی دیوار پر نصب سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا تو پورے کمرے میں روشنی پھیل گئی' لائٹ آن کر کے وہ واپس بیڈ کے پاس آ گیا۔ وہ کتاب اُس کے بستر پر پڑی ہوئی تھی جسے وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا اُس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کی دائیں جانب پڑے ہوئے میز سے موبائل فون اُٹھا کر دیکھا تو 16 New Masages لکھا ہوا تھا' اُس نے میسج پڑھے بغیر ہی ڈیلیٹ کر دیئے اور موبائل واپس میز پر رکھ دیا اور کتاب اُٹھا کر اُس کے ورق اُلٹنے لگا۔

کتاب پڑھنے کا تو جی ہی نہیں تھا لیکن جب ورق اُلٹتے اکتا گیا تو کتاب بند کر کے اپنے تکیے پر رکھ کر وہ کمرے سے باہر چلا آیا۔

صحن میں گھپ اندھیرا تھا لیکن وہ اندھیرے کو نظر انداز کر کہ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر اندھیرے میں چلنے کے بعد اُس کی آنکھیں اندھیرے سے مسخر ہو گئیں تھیں اور چھت پر پہنچ کر تو سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا، چاند کی روشنی کی وجہ سے رات کا اندھیرا پھیکا پڑ گیا تھا۔ تمام گھر والے اس وقت گہری نیند سوئے ہوئے تھے لیکن اُس کی آنکھوں سے نیند اوجھل تھی' رات کے اس وقت ہر طرف جہاں تک نظر جاتی تھی سناٹا چھایا ہوا تھا کہیں دور سے جانوروں کی ہلکی ہلکی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں اُس نے سر اُٹھا کر اُوپر آسمان کی طرف دیکھا ' آسمان پر تو جیسے جشن کا سماں تھا پورا چاند اور اُس چاند کی روشنی سے جگماتے ستارے' چاند اس وقت ستاروں کی نگاہوں کا ایسے مرکز بنا ہوا تھا جس طرح سینکڑوں باراتیوں میں بھی دولہا سب کی نظروں کا مرکز ہوتا ہے ۔ستاروں کی چمک کو دیکھ کر لگتا تھا کے وہ آج بہت خوش ہیں ان کی خوشی دیکھ کر تو وہ کچھ وقت کے لیئے اپنی اُداسی

بھی بھول گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی چھت پر ٹہلتا رہا لیکن جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو واپس اپنے کمرے میں آ گیا وہ سکون سے سونا چاہتا تھا لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆......☆......☆

امی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے ہوا تھا۔

''عمر اُٹھو بیٹا کالج نہیں جانا آج اتنی دیر ہوگئی ابھی تک سو رہے ہو'' اُنھوں نے اُس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔

''نہیں امی آج دل نہیں کر رہا'' عمر نے پھر سے اپنا چہرہ چادر کے پیچھے چھپالیا۔

''کیا ہوا میرے چاند تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے'' وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

''بس امی سر میں تھوڑا سا درد ہو رہا ہے'' اُس نے اپنا سر امی کی گود میں رکھ دیا۔

''ارے تمھیں تو بہت تیز بخار ہے اور تمھاری آنکھوں میں سُرخی دیکھ کر لگتا ہے رات کو تم ٹھیک طرح سے سوئے نہیں'' اُنھوں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حرارت چیک کرتے ہوئے کہا۔

''جی امی نیند نہیں آرہی تھی''۔

''نیند کیسے آتی اتنا تیز بخار ہے کتنی دفعہ تم سے کہا ہے کے سردی ہے بیٹا کوئی جرسی سوئیٹر پہن لیا کرو لیکن نہیں آج کل کے بچے سُنتے ہی کہاں ہے کسی کی اب لگ گئی نہ سردی اور اُوپر سے ساری رات تکلیف میں گزار دی کوئی دوا ہی کھا لیتے اور اگر نہیں مل رہی تھی تو مجھے ہی جگا دیتے اتنے بڑے ہوگئے ہو تم لیکن حرکتیں وہی بچوں والی''

امی اُسے ڈانٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اُس کا سر بھی دبا رہی تھیں اور وہ بھی خاموشی سے آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔

''اچھا ابھی تم منہ ہاتھ دھو لو میں تمھارے لیئے کھانا لاتی ہو اور ساتھ کوئی دوا بھی تا کے تمھارا بخار کچھ کم ہو جائے اور پھر شام کو ڈاکٹر کو دکھا لینا''۔

''جی امی......'' اُس نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

''چلو شاباش اُٹھ جاؤ میں کھانا لے کر آرہی ہوں''۔

عمر مشکل سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

☆......☆......☆

احمد اور اُس کے دوست میکڈونلڈ کے پرسکون ماحول میں برگر اور کولڈ ڈرنک سے محظوظ ہو رہے تھے۔امتحان میں کامیابی اور بھائی کی شادی کی خوشی میں احمد اپنے دوستوں کو پارٹی کروانے کے لیئے میکڈونلڈ میں لے کر آیا تھا۔وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے کے اچانک احمد کی نظر دائیں جانب سامنے والے ٹیبل پر پڑی تو ایک پل کو ٹھہر سی گئی' لائٹ بلیو کلر کے سوٹ میں ملبوس اور چہرے پر ہلکا میک اپ اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ سجائے ہوئے وہ لڑکی جو سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک ضعیف العمر شخص سے گفتگو میں مصروف تھی احمد کے دل کو بہت اچھی لگی تھی۔احمد کچھ اس انداز سے بیٹھا ہوا تھا کے اُس شخص کی کمر اُس کی طرف تھی اور وہ لڑکی اُس کے سامنے کی طرف دوسری کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اس لیئے وہ اُس کا چہرہ آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

''احمد اپنی شادی کی پارٹی کب دے رہے ہو''۔

''ابھی اُس میں کافی ٹائم ہے'' وہ اپنے دوستوں سے بات کر رہا تھا لیکن اُس کی نظریں بار بار کہیں اور جا رہی تھیں۔

کچھ دیر تک وہ یوں ہی باتوں میں مصروف رہے پھر اچانک وہ شخص اُٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور وہ لڑکی بھی اُس شخص کے پیچھے چلی گئی۔احمد کی نظریں ابھی بھی اُسی لڑکی پر مرکوز تھیں۔جیسے ہی وہ شخص بل ادا کر کے واپس مڑا تو اُس کی جیب سے اُس کا پرس گر گیا احمد نے بھاگ کر پرس اُٹھایا اور واپس کرنے کی غرض سے باہر کی جانب بھاگا لیکن وہ دونوں نظروں سے غائب ہو چکے تھے اور وہ پرس احمد کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

☆......☆......☆

کتنا خوشگوار احساس تھا جب پہلی بار اُس کے دل نے بھی کسی کے نام پر دھڑکنا شروع کیا تھا جب اُس نے بھی کسی کو چاہا تھا بچپن کا ساتھ کب دوستی اور پھر محبت میں بدل گیا اُسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

عمر بچپن سے ہی جنت کی ہر چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتا تھا وہ پورا ہفتہ اپنا جیب خرچ اکٹھا کرتا رہتا

اور جب اتوار کو جنت آتی تو اُس کے لیئے کبھی کولڈ ڈرنک اور کبھی چپس کے پیکٹ لے کر آتا' عمر کو یہ سب کچھ کرنا بہت اچھا لگتا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کے جتنا اُس کا پورے ہفتے کا جیب خرچ ہے اُس سے زیادہ جنت کا ایک دن کا خرچ ہوتا ہے۔

وقت اپنی تیزی کے ساتھ پر لگا کر اُڑتا رہا اور وہ دونوں بچپن اور لڑکپن کی سرحد کو پار کر کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ کتنے دن لگے تھے عمر کو اپنے دل کو یہ سمجھانے کے لیئے کے جس جذبے کو وہ دوستی سمجھتا ہے وہ اب محبت کا روپ دھار چکا ہے اور وہ جنت کو بھی اپنی جذبات سے آگاہ کر دیتا اگر اُس رات وہ امی اور دادی کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سُن لیتا۔

وہ پانی پینے کے لیئے کچن میں آیا تھا واپس جاتے ہوئے دادی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اپنا ذکر سُن کر وہیں ٹھہر گیا۔

''عائشہ...... میرے خیال سے اب تمھیں عمر کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیئے'' دادی کی بات سُن کر عمر کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے اماں عمر کی پڑھائی پوری ہو جائے کوئی اچھی نوکری مل جائے تو پھر شادی بھی کر دیں گے'' امی نے دادی کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے تو میں کب کہہ رہی ہوں کے آج ہی شادی کروا دو عمر کی ویسے بھی ایک مہینہ رہ گیا ہے اُس کے امتحان ہونے میں اُس کے بعد کوئی نوکری بھی مل ہی جائے گی''۔

''اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں نہیں چاہتی کے ابھی اُس کی توجہ پڑھائی کے علاوہ کسی اور طرف مبذول ہو ایک بار وہ امتحانات سے فارغ ہو جائے تو پھر سوچیں گے کے آگے کیا کرنا ہے'' امی نے ٹرے میں سے کپ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو عائشہ اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور موت کا بھی کچھ بھروسہ نہیں کے کس وقت آجائے اس لیئے میں تو یہی چاہتی تھی کے مرنے سے پہلے اپنے پوتے کی خوشیاں دیکھ سکوں لیکن جیسی تمھاری مرضی'' دادی نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"اماں خدا کے لیئے ایسی دل دکھانے والی باتیں تو نہ کریں" اُنھوں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"اس میں دل دُکھانے والی کیا بات ہے موت ایک حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تمھارے ابا بھی تو ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے اور اسی طرح ہم سب کو بھی ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے" دادی نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیشک...... یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا" اُنھوں نے دادی کی بات کی تصدیق کی۔

تو پھر تم فراز سے بات کرو اور عمر کے امتحان ہوتے ہی شادی کی تیاریاں شروع کر دو۔

"ارے اماں تیاریوں کا مسئلہ تو لڑکیوں کی شادی میں ہوتا ہے اور جہاں تک بات عمر کی شادی کی تو اُس کے لیئے بھی ہمیں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ اُس کی نسبت تو بچپن سے ہی طے ہے مسئلہ تو تب ہوتا اگر ہم نے اُس کے لیئے لڑکی تلاش کرنی ہوتی"۔

منگنی کی بات سُن کر تو اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی یہ جان کر اُسے گہرا صدمہ پہنچا تھا کے وہ بچپن سے کسی کے ساتھ منسوب ہے اور اُسے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا' امی آگے بھی کچھ کہہ رہی تھیں لیکن اُس نے سننا ضروری نہیں سمجھا اور خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

رات گزر چکی تھی چاند اور ستارے بھی آسمان سے غائب ہو چکے تھے اور اب سورج اپنی روشنی سے دنیا مافیہا کی ہر چیز کو روشن کر رہا تھا۔ چہکتے ہوئے پرندوں کی آواز ماحول کو اور دلنشین بنا دیتی ہے صبح کا یہ منظر دلوں کو بہت بھلا محسوس ہوتا ہے۔ اتوار کی صبح یقیناً سب کے لیئے ہی خوشگوار ہوتی ہے کیونکہ اس دن ہر کوئی کام کاج کی پریشانیوں سے آزاد ہو کر اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔

وہ صبح سویرے باہر جانے کے لیئے تیار ہو گئی تھی اُس نے سُرخ رنگ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا سامنے والے ٹیبل پر رکھی ہوئی بوتل میں سے پرفیوم خود پر اُنڈیلی اور کندھے پر بیگ لٹکایا اور اپنی نئی کار کی چابی اُٹھا کر باہر نکل گئی۔

احمد صاحب لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور مسز احمد چائے سے لطف اندوز ہو رہیں تھیں۔

''اتنی صبح صبح کہاں جا رہی ہو بیٹا'' مسز احمد نے پاس سے گزرتی ہوئی جنت سے پوچھا جو انگلی میں گاڑی کی چابی گھماتی ہوئی باہر جا رہی تھی۔

''جی ماما میں بڑے ابو کے گھر جا رہی ہوں'' اُس نے رُک کر جواب دیا اور وہاں سے چلی گئی۔

''ہزار بار سمجھایا ہے اس لڑکی کو کے وہاں مت جایا کرو لیکن یہ میری سُنتی ہی کہاں ہے'' مسز احمد نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کیوں تمھیں جنت کے وہاں جانے پر کیا اعتراض ہے وہ اُس کے تایا کا گھر ہے اور اُس کی دادی بھی تو ہے وہاں تو پھر تم اُسے وہاں جانے سے کیسے منع کر سکتی ہو'' احمد صاحب نے اخبار ٹیبل پر رکھا اور مسز احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔

''پتا نہیں آپ لوگ کیسے چلے جاتے ہیں میرا تو وہاں دم گھٹتا ہے۔'' مسز احمد نے چائے کا سیپ بھرتے ہوئے کہا۔

''تمھارا تو شروع سے ہی دم گھٹتا تھا اسی لیئے تو تم نے ایک ہفتہ بھی اُس گھر میں رہنا گوارہ نہیں کیا'' احمد صاحب نے شکایتی نگاہوں سے مسز احمد کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے میں شروع سے ہی بڑے گھر میں رہنے کی عادی ہوں تو پھر اُس چھوٹے سے گھر میں کیوں کر رہ سکتی تھی'' مسز احمد نے کندھے اُچکائے۔

''جو اینٹ اور پتھر کا بنا ہو وہ گھر نہیں مکان ہوتا ہے گھر تو گھر والوں سے بنتا ہے اور فراز بھائی کا مکان بے شک ہمارے بنگلے کے مقابلے بہت چھوٹا ہے لیکن اُن کا گھر ہم سے کافی بڑا ہے''۔ احمد صاحب کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کے وہ اُس گھر کو چھوڑ کر پچھتا رہے ہیں۔

مسز احمد شاید اب مزید بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیئے خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گئیں اور احمد صاحب نے بھی پھر سے اپنا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا لیا۔

☆......☆......☆

اُس نے یونیورسٹی سے چھٹی کی اور صبح نو بجے تیار ہو کر ہوسٹل سے نکل گیا تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ٹھیک اُن

کے دروازے پر تھا اُس نے دروازے کے قریب لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔

''جی آپ کون اور کس سے ملنا ہے'' ایک اُدھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا جس کے خلیے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اُس گھر کی ملازمہ تھی۔

''جی آنٹی میرا نام احمد ہے اور مجھے محمود صاحب سے ملنا ہے'' احمد نے کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''محمود صاحب تو دفتر جا چکے ہیں اگر آپ کو اُن سے ضروری ملنا ہے تو اُن کے دفتر چلے جایئے''۔

''اچھا گھر میں کوئی اور ہے دراصل مجھے اُن کی ایک امانت واپس کرنی ہے''۔

''اُن کی بیٹی گھر میں ہیں آپ اندر آیئے میں اُنھیں اطلاع کرتی ہوں'' ملازمہ نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اطلاع دینے چلی گئی۔

''بی بی جی'' ملازمہ نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تکلیف ہے سلیمہ...... ہزار بار کہا ہے کہ صبح صبح تنگ نہ کیا کرو'' اُس نے ملازمہ کو جھڑک دیا۔

''بی بی جی......وہ......آپ سے ملنے کوئی احمد صاحب آئے ہیں'' ملازمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کون احمد میں تو کسی احمد کو نہیں جانتی'' زینب نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

''جی پتہ نہیں وہ کہہ رہے تھے کے اُن کے پاس آپ کی کوئی امانت ہے''۔

''اچھا تم اُنھیں بٹھاؤ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں'' نوکرانی کے جاتے ہی زینب واش روم میں گھس گئی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کروانے کے بعد زینب بی بی تشریف لے آئیں احمد نے زینب کو آتے دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔

''مجھے لگتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے'' زینب نے احمد کو گھورتے ہوئے کہا۔

''جی آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کے آپ کی یادداشت اتنی کمزور ہوگی اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو یہاں آتے وقت آپ کے لیئے بادام لے آتا''۔

''what you mean?'' زینب نے ذرا تیکھے انداز سے پوچھا۔

''مطلب یہ کے میڈم ابھی کل رات کو ہی تو آپ نے مجھے میکڈونلڈ میں دیکھا تھا اتنی جلدی بھول گئی''۔

''ہوسکتا ہے کہ وہیں دیکھا ہو...... خیر میرا نام زینب ہے'' اُس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''جی میرا نام احمد ہے''۔

''جی تو احمد صاحب ملازمہ بتا رہی تھی کے آپ کو کوئی امانت واپس کرنی ہے'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھا۔

''جی کل رات جب آپ کے پاپا بل ادا کر کے واپس پلٹے تو اُن کی جیب سے وائلٹ گر گیا تھا میں واپس کرنے کے لیئے بھاگا لیکن آپ لوگ جا چکے تھے اس لیئے میں یہی واپس کرنے آیا تھا'' احمد نے وائلٹ زینب کی طرف بڑھایا۔

زینب نے وائلٹ پکڑا اور اُسے کھول کر دیکھنے لگی۔

''جی بہت شکریہ آپ کا لیکن لگتا ہے آپ نے یہ وائلٹ کھول کر نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو یقیناً واپس لوٹانے نہ آتے'' زینب کی مشکوک نظریں احمد کا تعاقب کر رہی تھیں۔

''جی آپ کی معلومات کے لیئے عرض ہے کے میں یہ وائلٹ بڑی اچھی طرح سے دیکھ چکا ہوں اور اس میں جو شناختی کارڈ ہے اُسی سے مجھے آپ کے گھر کا ایڈریس پتا چلا ہے''۔

''حیرت کی بات ہے اتنے سارے پیسے دیکھ کر بھی آپ یہ وائلٹ لوٹانے آ گئے ایک بار بھی آپ کے دل میں خیال نہیں آیا کے میں یہ سب کچھ رکھ لوں'' زینب نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''جی یقیناً اس میں بہت زیادہ پیسے ہیں لیکن میں اُن میں سے نہیں جو پیسوں کی خاطر اپنی دنیا و آخرت خراب کر لیتے ہیں، آپ کی امانت کو آپ تک پہنچانا میرا فرض تھا اس لیے میں نے پہنچا دیا سو اب میں چلتا ہوں'' احمد اُٹھ کر جانے لگا تو محمود صاحب کو آتا دیکھ کر رُک گیا۔

''بابا جان آپ ابھی تک آفس نہیں گئے'' زینب نے محمود صاحب کو دیکھ کر کہا جو مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

''بیٹا میں آفس گیا تھا لیکن میرا وائلٹ گھر رہ گیا تھا اس لیئے مجھے واپس آنا پڑا'' محمود صاحب نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

”جی نہیں آپ کا وائلٹ گھر میں نہیں بلکہ کل رات کو ریسٹورنٹ میں گر گیا تھا اور یہ احمد صاحب ابھی واپس کرنے آئے ہیں“ زینب نے احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”السلام وعلیکم “احمد نے محمود صاحب کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

”وعلیکم السلام بہت بہت شکریہ...... کیا تم اُس ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہو“ محمود صاحب نے احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سر میں تو ایم بی اے کا سٹوڈنٹ ہوں کل رات کو میں اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا تھا آپ جب بل ادا کر رہے تھے تو یہ وائلٹ گر گیا تھا مجھے مل گیا اس لیئے میں واپس کرنے آ گیا“۔

”بہت شکریہ بیٹا کے آپ نے ہمارے لیے اتنی تکلیف اُٹھائی“۔

”سر اس میں شکریہ ادا کرنے والی کونسی بات ہے یہ تو آپ کی امانت تھی سو میں نے آپ تک پہنچادی“۔

تمھاری ایمانداری نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور یقیناً اس کا کوئی انعام بھی ہونا چاہیے“ اُنھوں نے کچھ نکالنے کی غرض سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالی مجھے اس کا صلہ ضرور دے گا اس لیے میں آپ سے کوئی انعام نہیں لے سکتا لیکن ہاں اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو اب مجھے اجازت دیجئے“۔

”بیٹا اگر تم کہو تو میں تمھیں چھوڑ دیتا ہوں“ محمود صاحب نے پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

”جی بہت شکریہ سر لیکن آپ کو تکلف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں چلا جاؤں گا“۔

”جیسے تمھاری مرضی بیٹا بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر“۔

”مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی...... اب میں چلتا ہوں...... خدا حافظ“ اُس نے الوداعی کلمات ادا کیے اور چلتا بنا۔

”یقیناً یہ کسی اچھے گھر کی پرورش کا نتیجہ ہے اور آجکل ایسے چند ہی ملتے ہیں“ محمود صاحب نے وائلٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہ کوئی پاگل ہی لگتا ہے جس نے ثواب کی خاطر انعام لینے سے انکار کر دیا“ زینب نے کندھے

اُچکائے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

کتابیں کمرے کے فرش پر قالین کی طرح بچھی ہوئی تھیں اور وہ کھڑکی کے ساتھ کندھا ٹکائے کھڑا تھا اُس کے چہرے پر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح (جس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہو) اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

"باہر اتنا اچھا موسم ہے اور تم یہاں کمرے میں پڑے ہوئے ہو" جنت نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شکایتی انداز میں کہا۔

جنت کو دیکھ کر اُس نے سوچا کے تقدیر بھی انسان کے کتنے امتحان لیتی ہے وہ جسے کئی دنوں سے نظرانداز کر رہا تھا وہ آج خود چل کر اُس کے سامنے آ گئی تھی۔

"جنت تم یہاں کیسے" اُس نے بجھے سے انداز میں پوچھا۔

"کیوں یہ میرے بڑے ابو کا گھر ہے اب یہاں آنے سے پہلے مجھے تمھاری اجازت لینی پڑے گی اور کیا تکلیف ہے تمھیں اتنے دنوں سے میں میسج کر رہی ہوں تم کوئی جواب ہی نہیں دیتے اور فون کرتی ہوں تو تم ریسیو ہی نہیں کرتے آخر تمھارا مسئلہ کیا ہے" جنت نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

"میری طبیعت خراب تھی اس لیئے......" وہ بات کر رہا تھا لیکن جنت نے اُس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"طبیعت خراب تھی تو بتا نہیں سکتے تھے میں سوچ رہی تھی کے شاید تم مجھ سے ناراض ہو اس لیئے مجھ سے بات نہیں کر رہے اچھا اب تمھاری طبیعت کیسی ہے" اُسے اچانک حال چال پوچھنے کا خیال آیا۔

"اب پہلے سے کافی بہتر ہے یہ بتاؤ تم یہاں کیسے کوئی کام تھا کیا" عمر نے جنت سے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

"ہاں مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے چلو نہ کہیں باہر چلتے ہیں" جنت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا"۔

''کیوں''؟ جنت نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''بس ایسے ہی''۔

''ناراض ہو مجھ سے......؟''

''نہیں تو......''۔

''تو پھر کیا مسئلہ ہے میرے ساتھ جانے میں......؟''

''بتایا تو ہے کہ میری طبیعت خراب ہے'' اُس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

دیکھو میں جانتی ہوں کہ تم بخار کی وجہ سے چڑ چڑے ہو گئے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میرے ساتھ اس طرح بے رُخی سے پیش آؤ اور اگر اسی طرح بند کمرے میں اکیلے پڑے رہو گے تو طبیعت ٹھیک ہونے کی بجائے اور خراب ہو گی اور.....اگر...میرے ساتھ باہر چلو گے تو تمھارا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا اور طبیعت بھی'' وہ اپنی بات پر بضد تھی۔

''جنت پلیز ضد نہ کرو''۔

''کتنے بدل ہو گئے ہو تم عمر پہلے میں ایک بار کہتی تھی تم میری بات مان لیتے تھے اور آج اتنی منتیں کروا رہے ہو'' اُس نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''پہلے کی بات اور تھی......''۔

''کیا مطلب......؟'' اُس کی آنکھوں میں پھر سے سوال تھا۔

''وہ......چھوڑو تم نہیں سمجھو گی'' وہ کہتے کہتے رُک گیا تھا۔

''میں کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی اور نہ ہی کچھ سننا چاہتی ہوں اس لیے اب اپنی بکواس بند کرو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلو'' جنت نے زبردستی عمر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔

''ہاتھ چھوڑو میرا نہیں جانا مجھے کہیں بھی'' عمر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''جب تم سے ایک بار کہا ہے کہ نہیں دل کر رہا میرا کہیں جانے کو تو پھر زبردستی کیوں کر رہی ہو' میں کوئی تمھارا ملازم نہیں ہوں کے تمھارے حکم پر اپنی زندگی گزاروں جب تم کہو کھڑے ہو جاؤ تو میں کھڑا ہو جاؤں جب

تم کہو بیٹھ جاؤ تو میں بیٹھ جاؤں اور جب تم کہو کے گھومنے چلو تو میں چپ چاپ کسی باادب غلام کی طرح تمھارے پیچھے پیچھے چلتا جاؤں میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے اب میں ہر وقت تمھارے اشاروں پر تو نہیں ناچ سکتا'' آج پہلی بار عمر نے جنت سے اس طرح غصے میں بات کی تھی جنت کو تو کچھ وقت کے لیئے یقین ہی نہیں آیا کے عمر اُس سے اس لہجے میں بات کر سکتا ہے عمر کی باتیں سُن کر بہت بُرا لگا اور جنت کی آنکھوں میں آنسو موتی کی طرح چمکنے لگے اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور آنکھوں میں آنسو لیئے تیزی سے باہر چلی گئی۔ عمر اُسے جاتا دیکھتا رہا شاید اُسے بھی یقین نہیں آرہا تھا کے اُس میں اتنی ہمت کیسے آگئی تھی۔

☆......☆......☆

پچھلے دو گھنٹے سے وہ لائن میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا نوکری ایک تھی لیکن اُمیدواروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک سو سے زیادہ اُمیدوار قسمت آزمائی کر چکے تھے اور اتنے ہی ابھی لائن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ارے احمد صاحب آپ اور یہاں'' احمد آنکھیں بند کیے ہوئے منہ میں درود شریف پڑھ رہا تھا کہ ایک آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ارے آپ...... کیسی ہیں آپ'' اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے زینب تھی۔

''Iam good What a pleasant Surprise to see you Once again میں تو یہاں بابا سے ملنے آئی تھی لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ یوں آپ سے ملاقات ہو جائے گی''۔

''سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا لیکن کیا بات ہے آج آپ نے اتنی بھیڑ میں بھی مجھے پہچان لیا......لگتا ہے کہ آپ نے بادام کھانا شروع کر دیے ہیں'' احمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل آجکل اکثر ہمارے گھر میں آپ کا ہی تذکرہ ہوتا رہتا ہے''۔

''میرا تذکرہ......لیکن وہ کیوں......؟'' زینب کی بات سُن کر اُسے حیرت ہوئی تھی۔

''بس یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کی اُس ایک نیکی نے بابا کو اتنا متاثر کیا ہے کہ اُس دن سے وہ روزانہ آپ کا ہی ذکر کرتے ہیں''۔

''جی بہت شکریہ لیکن میرا کسی کو متاثر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا میں نے تو صرف وہی کیا جو میرے دل نے

کہا“۔

”آپ کی شخصیت ہی اتنی متاثر کن ہے کہ کوئی بھی آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا“۔

”تو کیا آپ بھی مجھ سے متاثر......“ احمد نے کن اکھیوں سے زینب کیطرف دیکھا۔

”اب مجھے چلنا چاہیے بابا میرا انتظار کررہے ہوں گے“ زینب نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میری طرف سے اُنھیں سلام کہہ دیجیے گا“۔

”ارے یہ ساتھ ہی تو بابا کا کیبن ہے آپ خود چل کر اُن سے ملاقات کرلیں“۔

”میں ضرور چلتا لیکن انٹرویو کیلئے اگلی باری میری ہے“ اُس نے فوراً معذرت کرلی۔

”ویسے شاید آپ جانتے نہیں کہ یہ میرے بابا کی کمپنی ہے اور بابا آپ سے جتنے امپریس ہیں آپ کو تو بغیر انٹرویو کے ہی جاب مل جائے گی“۔

”آپ کی آفر کیلئے شکریہ لیکن میں اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر جاب حاصل کرنا چاہتا ہوں“ اُسے اپنی خودداری زیادہ عزیز تھی۔

”مسٹر احمد آپ اندر تشریف لے جایئے“ دروازے پر کھڑے چپڑاسی نے صدا لگائی۔

”Ok Then Best Of luck“ اُس نے بھی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

”Thank You Very Much“ احمد نے شکریہ ادا کیا اور انٹرویو کے لیے اندر چلا گیا۔

☆......☆......☆

امی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

”عمر بیٹا کیا بات ہے میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں تم ہر کام میں سستی دکھا رہے ہو نہ تم اچھے سے کھانا کھاتے ہو نہ اچھے طریقے سے کسی سے بات کرتے ہو نہ کہیں باہر جاتے ہو بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑے رہتے ہو آخر کیا مسئلہ ہے تمھیں؟“ امی کی آواز سُن کر عمر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

”امی آپ جانتی ہیں میری طبیعت خراب ہے اسی لیئے تھوڑی سی سستی آگئی ہے“۔

”کل جنت سے کیا کہا تھا تم نے وہ بہت رو رہی تھی“ وہ اُس کے پاس بیٹھ گئیں تو عمر نے امی کی گود میں سر

رکھ دیا۔

''امی آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کے میری منگنی بچپن میں ہی ہو گئی تھی''۔

''یہ تم سے کس نے کہا''۔

''اُس رات میں نے آپ کی اور دادی کی باتیں سُن لیں تھیں'' عمر نے مدھم سی آواز میں جواب دیا۔

''عمر بیٹا یوں چھپ کر بڑوں کی باتیں سننا تو بہت ہی بری بات ہے'' امی نے اُسے ڈانٹ دیا۔

''ہاں بیٹا میں نے تمھیں اس لیئے نہیں بتایا کیوں کے میں چاہتی تھی کے ابھی تم صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور ان چکروں سے دور رہو''۔

''امی اگر میں اُس لڑکی سے شادی نہ کرنا چاہوں تو کیا آپ میرے لیئے یہ منگنی توڑ نہیں سکتیں''۔

''نہیں بیٹا یہ تمھارے دادا کا فیصلہ تھا اگر وہ اس دنیا میں ہوتے تو پھر شاید کچھ ہو بھی سکتا تھا لیکن اب تو کوئی بھی اُن کی خواہش کو نہیں توڑ سکتا'' امی نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''لیکن امی میں کسی اور کو پسند......'' اُنھوں نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''عمر ایک اچھا بچہ وہی ہوتا ہو جو اپنے ماں باپ کے فیصلے کو پورے دل سے تسلیم کرے دیکھو میں نے اور تمھارے ابا نے بھی اپنے بڑوں کا فیصلہ مان کر شادی کی تھی اور ساری زندگی سکون سے گزر گئی اور مجھے اُمید ہے کے تم بھی اپنے بڑوں کا فیصلہ پورے دل سے تسلیم کرو گے''۔

''جی امی'' اُس نے اچھے بچے کی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اچھا میں تو سمجھتی تھی کہ تم اور جنت ایک دوسرے کو بچپن سے ہی پسند کرتے ہو اور جب تم کو پتا چلے گا کہ جنت تمھاری منگیتر ہے تو تم......''۔

''کیا جنت......'' جنت کا نام سُن کر وہ یوں اُچھلا جیسے زوردار کرنٹ لگا ہو۔

''ہاں تو اس میں اتنا چونکنے کی کیا بات ہے تم تو کہہ رہے تھے کہ تم ہماری ساری باتیں سُن چکے ہو''۔

مجھے تو منگنی کی بات سُن کر ہی اتنا برا لگا کہ باقی کچھ سننے کا کچھ ہوش ہی نہیں رہا''۔

''تو اسی لیئے تم اتنے دنوں سے جنت سے بات نہیں کر رہے تھے'' اُنھیں اب سارے واقعے کی سمجھ آئی۔

’’مجھے لگا کہ شاید آپ نے کسی اور سے......اس لیے میں جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کر رہا تھا اور کل تو اُس کا دل بھی دکھا دیا‘‘۔

’’حد کرتے ہو تم بھی عمر‘‘۔

’’سوری امی‘‘ یقیناً اُس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

’’بیوقوف سوری مجھے نہیں بلکہ جا کہ جنت کو کہو اور ہاں ایک بات اور اب تم لوگوں نے ساری زندگی ساتھ گزارنی ہے اس لیئے اُسے تنگ کرنا چھوڑ دو‘‘ اُنھوں نے پیار سے اُس کا کان کھینچتے ہوئے کہا۔

کتنے دنوں بعد عمر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی آج وہ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے کسی قیدی کو لمبی قید کے بعد جیل سے رہائی مل گئی ہو۔

☆......☆......☆

’’السلام وعلیکم‘‘ احمد نے گھر میں داخل ہوتے ہی سلام پیش کیا۔

’’آ گئی یاد ہماری صاحب زادے کو‘‘ اماں نے بھی دیکھتے ہی شکوہ کر دیا۔

’’کیا کروں اماں آج کل کام بہت زیادہ ہے وقت ہی نہیں ملتا اور جیسے ہی تھوڑا سا وقت ملتا ہے بھاگ کر چلا آتا ہوں اپنی پیاری اماں کے پاس‘‘ احمد نے پیار سے اپنے دونوں بازوں اماں کی گردن کے گرد ڈال دیے۔

’’چل چھوڑ مجھے یہ سب دکھاوا نہ کیا کر احمد اگر اتنی فکر ہوتی نہ میری تو یوں ہفتوں بعد مہمانوں کی طرح نہ آتا‘‘ اماں کے لہجے میں بدستور شکایت تھی۔

’’اماں مجبوری ہے میری کام کی وجہ سے دور رہنا پڑتا ہے اور آپ سے بھی تو کتنی دفعہ کہا ہے کے میرے ساتھ شفٹ ہو جائیں اتنا بڑا گھر ہے لیکن ابا مانتے ہی نہیں تو پھر میں کیا کروں اتنی اچھی نوکری بھی تو نہیں چھوڑ سکتا‘‘ احمد نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

’’اچھا اب آ ہی گئے ہو تو ایک خوشی کی بات بھی سُن لو ہم نے تمھاری شادی کی بات پکی کر دی ہے‘‘ اماں کی بات سُن کر احمد پر تو گویا کوئی پہاڑ گر گیا ہو۔

’’اماں آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا‘‘ احمد کے لہجے میں بے یقینی اور حیرانگی کے ملے جلے

تاثرات تھے۔

''پوچھنے والی کونسی بات ہے تم میرے بیٹے ہو اور کیا مجھے اتنا حق نہیں کے میں تمھارے لیے کوئی فیصلہ کر سکوں''۔

''آپ کو پورا حق ہے اماں لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا'' اُس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

''اب تو تمھاری پڑھائی بھی ختم ہوگئی ہے اور تمھیں نوکری بھی مل گئی ہے پھر تم میری بات مان کیوں نہیں لیتے دیکھو تم اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہو اور کھانا بھی باہر سے کھاتے ہو مجھے ہر وقت تمھاری فکر لگی رہتی ہے اگر شادی کرلو گے تو کم از کم تمھارے یہ مسئلے تو حل ہو جائیں گے''۔

''اماں میں یہ شادی نہیں کرسکتا'' اُس نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔

''بس احمد اتنی دیر سے تم ہم سب کو بہلا رہے ہو اب اور نہیں تمھارے ابا فزا کے گھر والوں کو زبان دے چکے ہیں اب تمھیں فزا سے شادی کرنی ہی ہوگی'' اس سے پہلے کے احمد اماں کو زینب کے بارے میں بتاتا اماں نے اُسے اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا۔ وہ جانتا تھا کے ابا نے جو ایک بار کہہ دیا بس وہ ہو کر ہی رہے گا اس لیئے اُس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆......☆......☆

''آج کل تو شادیوں کا سیزن چل رہا ہے پتا نہیں کیوں عید الضحیٰ کے بعد اور محرم الحرام سے پہلے لوگ اس طرح شادیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے پھر پورا سال یہ موقع نہیں ملے گا'' وہ سیڑھیوں سے نیچے اُترتے ہوئے بڑھ بڑھا رہی تھی۔

''ماما چلیں نہ آج شاپنگ کے لیئے چلتے ہیں'' اُس نے ماما کے گلے کے گرد باہیں ڈال دیں جو صوفے پر بیٹھی موبائل کو گھور رہی تھیں۔

''شاپنگ کس خوشی میں......؟'' ماما نے موبائل سے ایک پل کو نگاہ ہٹائی۔

''ماما آپ کو یاد نہیں اگلے ہفتے فریال کی شادی ہے اور مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے''۔

''جنت آج میں نہیں جا سکتی مجھے بہت کام ہے تم ایسا کرو اپنی کسی دوست کے ساتھ چلی جاؤ'' وہ پھر سے

موبائل کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔

''آپ تو جانتی ہیں میری ایک ہی دوست ہے اور وہ بھی اپنے کزن کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی ہے، اس لیئے میں کسی اور کے ساتھ نہیں جاسکتی اور ماما کام تو آپ روز کرتی ہیں تو ایک دن نہ کریں گی تو کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی'' اُس نے روندی صورت بنائی۔

''بیٹا آج آفس میں ایک بہت ضروری میٹنگ ہے اور تمھارے پاپا بھی یہاں نہیں ہیں اس لیئے آج تو میرے پاس بالکل بھی فرصت نہیں ہے تم ایسا کرو عمر کو اپنے ساتھ لے جاؤ''۔

''ماما میں عمر کے ساتھ نہیں جاسکتی'' اُس نے فٹ سے منع کر دیا۔

''حیرت ہے یہ تم کہہ رہی ہو......؟'' اُن کو بھی اپنی سماعت پہ یقین نہیں آیا تھا۔

''جی ماما''۔

کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں تم اُس کے ساتھ نہیں جاسکتی......''۔

''بس ایسے ہی......''۔

''ایسے ہی تو تم نہیں کہہ رہی ضرور کوئی بات ہے'' اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

''وہ اصل میں...... ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا'' بالآخر اُس نے بتا ہی دیا۔

''جنت اب تم لوگ بچے نہیں ہو جو اس طرح لڑتے جھگڑتے رہو تم جا کر تیار ہو جاؤ میں فون کر رہی ہوں وہ تمھارے ساتھ چلا جائے گا''۔

''عمر کے ساتھ جانے سے تو اچھا ہے کہ میں اکیلی چلی جاؤں'' اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''مائی ڈئیر یہ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ اکیلے تم کتنی اچھی شاپنگ کرتی ہو اس لیے ضد چھوڑ و اور جا کر تیار ہو جاؤ میں عمر کو کال کر رہی ہوں''۔

''کوئی ضرورت نہیں کال کرنے کی مجھے کہیں نہیں جانا'' جنت نے چلاتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

جنت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں لیٹی ہوئی تھی اُس کے ایک ہاتھ میں چپس کا پیکٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹیلیوژن کا ریموٹ جس سے وہ بٹن دبا کر چینل تبدیل کر رہی تھی' عمر بغیر دستک دیئے ہی اُس کے کمرے میں چلا آیا تو وہ جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''تمھیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کے کسی کے کمرے میں بغیر اجازت داخل نہیں ہوتے'' جنت نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

''سوری......'' عمر کو اپنی حرکت پر کچھ شرمندگی ہوئی۔

''کیوں آئے ہو تم یہاں'' اُس نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ آنٹی نے مجھے فون کیا تھا کے جنت کو شاپنگ کے لیئے جان............'' اُس نے بات کاٹ دی تھی۔

''مجھے تمھارے ساتھ کہیں نہیں جانا میں خود چلی جاؤں گی'' جنت پھر سے ریموٹ کے بٹن دبانے میں مصروف ہوگئی۔

''ویسے آج کل تم میری کال ریسیو نہیں کرتی'' اُس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو میرا فون ہے میں اُٹھاؤں یا نہ اُٹھاؤں تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے'' اُس نے بڑی بے دردی سے جواب دیا۔

''اب تک ناراض ہو''......۔

'''انسان ناراض اپنوں سے ہوتا ہے اور تم میرے لگتے کیا ہو جو میں تم سے ناراض ہونے لگی'' وہ اپنی ساری بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔

''جنت میں جانتا ہوں تم اب تک مجھ سے ناراض ہو دراصل میں کچھ پریشان تھا اور سارا غصہ تم پر نکل گیا میں اپنی غلطی کے لیئے تم سے معافی مانگتا ہوں''۔

''تو کیا میں تمھیں پنچنگ بیگ (Punching Bag) نظر آتی ہوں جو تم اپنا سارا غصہ مجھ پہ نکال دو گے''۔

''جنت مجھے احساس ہے کہ میں نے تمھارا دل دکھایا ہے لیکن میرا یقین کرو میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ

ہوں اور سچے دل سے تم سے معافی مانگتا ہوں' وہ اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''ایک شرط پہ معاف کروں گی اگر تم یہ بتا دو کے تم کس وجہ سے پریشان تھے'' اُس نے شرط رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بتا دوں گا لیکن ابھی تم تیار ہو جاؤ ہمیں شاپنگ کے لیئے جانا ہے''۔

''تم نیچے میرا انتظار کرو میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں......'' اُس کا غصہ بھی دو پل کا ہی تھا۔

''ٹھیک ہے تم نیچے آ جاؤ تب تک میں گاڑی نکالتا ہوں''۔

''نہیں گاڑی رہنے دو بائیک پہ چلتے ہیں تم تو جانتے ہو مجھے بائیک پہ سفر کرنا اچھا لگتا ہے''۔

''ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی......تم تیار ہو کر نیچے آ جاؤ میں تب تک بانو کا حال چال پوچھ لوں''۔

''کیا بات ہے آج کل بانو کے ساتھ بڑی گپ شپ ہو رہی ہے'' اُس نے گھورتی نظروں سے عمر کو دیکھا۔

''کیوں تمھیں جلن ہو رہی ہے'' اُس نے کن اکھیوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

نہیں مجھے کیوں جلن ہوگی'' اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں نیچے تمھارا انتظار کر رہا ہوں'' اُس نے دروازہ بند کیا اور باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

''جب ہم گھر سے نکلے تھے تو اچھی خاصی دھوپ تھی اور اب دیکھو آسمان پر کیسے بادل چھائے ہوئے ہیں جیسے ابھی بارش ہونے والی ہے'' اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر موسم کا اندازہ لگایا۔

''اللہ کرے کہ بارش ہو جائے مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے'' جنت نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے بارش بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اور یہ کار نہیں ہے بائیک ہے زیادہ ہلاؤ مت ورنہ ہم گر جائیں گے'' اُس نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''تمھیں بارش اچھی نہیں لگتی لیکن وہ کیوں......''۔

''بس اپنی اپنی پسند ہے......''۔

”لیکن بچپن میں تو تمھیں بارش بہت پسند تھی کیا تمھیں یاد نہیں کہ کس طرح ہم لوگ گھنٹوں بارش میں کھیلتے رہتے تھے“ اُس نے سنہرے دور کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

”بچپن کی بات اور تھی یار اب کی بات اور ہے“۔

”کیوں بچپن میں ایسا کیا تھا جواب نہیں ہے“۔

”فکر......“ عمر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”فکر کس چیز کی فکر......؟“۔

”دنیا کی فکر......لوگوں کی باتوں کی فکر......مثال کے طور پر بچپن میں تم گھنٹوں بارش میں کھیلتی تھی رہتی تھی تمھیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے لیکن آج ایسا کرنے سے پہلے تم ہزار بار سوچو گی“ اُس نے بائیک کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

”تو صرف لوگوں کی باتوں کی وجہ سے تم نے بارش کو انجوائے کرنا چھوڑ دیا......“۔

”بارش کو انجوائے نہ کرنے کی ایک وجہ حکومت بھی ہے“ اُس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تمھیں حکومت کے کسی نمائندے نے منع کیا ہے“۔

”منع تو نہیں کیا لیکن جس طرح ہمارے وزیرِ اعلیٰ صاحب ہمارے شہر کو پیرس بنانے میں لگے ہوئے ہیں جب بارش ہوتی ہے تو یہی پیرس وینس بن جاتا ہے پھر ہمارے پاس کشتی بھی نہیں ہوتی تو سکول اور کالج جانے میں بڑا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اب ہماری اتنی تو اوقات نہیں کہ وزیرِ اعلیٰ صاحب سے کچھ کہیں اس لیے ہم نے بارش کی تمنا کرنا ہی چھوڑ دیا ہے“۔ اس بات پر دونوں نے ایک زوردار قہقہ لگایا۔

”تم نے چھوڑ دیا ہوگا میں تو اب بھی بارش کو انجوائے کرتی ہوں اور وہ بھی بغیر کسی فکر اور پریشانی کہ“۔

”وہ کیسے......؟“۔

”جب بھی بارش ہوتی ہے نہ میں اپنی چھت پر چلی جاتی ہوں اور اپنا چہرہ آسمان کی طرف کر کہ آنکھیں بند کر لیتی ہوں جب جب بارش کی بوندھیں میرے چہرے پر گھرتی ہیں میں پھر سے اپنے بچپن کی سُنہری وادیوں میں کھو جاتی ہوں اور خوب انجوائے کرتی ہوں کاش آج بارش ہو جائے تو میں تمھیں بھی انجوائے کرنا سکھا دوں

گی'' اُس کا یہ کہنا ہی تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔

''کیا بات ہے آج تو قدرت بڑی مہربان ہے تم پر'' اُس نے ایک دوکان کے سامنے بائیک روکتے ہوئے کہا۔

''اگر قدرت مہربان ہو ہی گئی ہے تو تم کیوں رُک گئے ہو''۔

''دیکھو تو سہی کتنی تیز بارش ہے کچھ دیر یہی رُک جاتے ہیں پھر بارش کم ہوتی ہے تو چلتے ہیں'' اُس نے بائیک سٹینڈ پہ کھڑی کی اور دکان کے سامنے چھپر کے نیچے جا کے کھڑے ہو گئے۔

''جس طرح آسمان پر کالے بادل ہیں مجھے نہیں لگتا کہ یہ بارش رُکنے والی ہے اس لیے یہاں کھڑے رہ کر وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ بارش میں بھیگ کر گھر چلتے ہیں'' جنت نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''لگتا تو مجھے بھی یہی ہے لیکن کچھ دیر دیکھ لیتے ہیں''۔

''دیکھو نے یہاں کتنے آدمی اکٹھا ہونے شروع ہو گئے ہیں میرے خیال سے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے'' بارش سے بچنے کے لیے سبھی چھپر کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر آج تمھاری مان کے بارش میں بھی بھیگ لیتے ہیں'' اُس نے موٹر سائیکل کو کک ماری اور پھر سے سفر کرنے لگے۔

''اچھا سچ یاد آیا مجھے تو تمھیں بارش کو انجوائے کرنے کا طریقہ بتانا تھا'' اُسے اچانک سے یاد آیا تھا۔

اگر بائیک چلاتے وقت آنکھیں بند کروں گا تو گھر پہنچنے کی بجائے ہاسپٹل پہنچ جائیں گے اور ویسے بھی اتنی بارش میں بائیک بڑی مشکل سے چل رہی ہے پھر کبھی بارش ہو گی تو پھر سیکھ لیں گے۔

''چلو ٹھیک ہے بارش کچھ کم ہوتی ہے تو پھر بتاتی ہوں'' وہ اپنی بات پہ بضد تھی۔

''اچھا تم نے کہا تھا کے راستے میں بتاؤں گا اور اب تو ساری شاپنگ بھی ہوگئی اور کچھ دیر میں ہم گھر بھی پہنچ جائیں گے لیکن تم نے ابھی تک وہ بات نہیں بتائی''۔

''کونسی بات'' عمر نے بھولا بننے کی کوشش کی۔

''وہی جس کی وجہ سے تم نے میرے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیا تھا'' جنت نے بھی طنز کا تیر برساتے ہوئے کہا۔

''پہلے ہی بُری طرح بھیگ چکا ہوں اور پھر اتنی بارش میں بائیک چلاؤں کے تمھارے سوالوں کے جواب دوں'' اُس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''ہاتھوں سے بائیک چلاؤ اور منہ سے میرے سوالوں کے جواب بھی دو'' لیکن وہ بھی کوئی بہانہ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''یار سمجھ نہیں آ رہی کہ کیسے کہوں'' اُس نے بائیک کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی پریشانی کی بات ہے'' جنت نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں پریشانی کی تو کوئی بات نہیں''۔

''تو پھر کیا بات ہے تم بتاتے کیوں نہیں''۔

''دراصل......وہ بات......یہ ہے کہ......''۔

یہاں میری جان نکلی جا رہی ہے اور تم یہ ہے وہ ہے میں وقت برباد کر رہے ہو تمھیں میری قسم ہے جو بھی بات ہے صاف صاف بتاؤ'' اُس نے اپنی قسم دے دی تھی۔

''اچھا یہ بات ہے تو پھر سنو میری پریشانی کی وجہ تم تھی'' عمر نے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ سے اُتری اور اُس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں......میں نے ایسا کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تمھیں پریشانی ہوئی'' اُس نے اپنے ہاتھ سے چہرے پر آئے ہوئے گیلے بالوں کو پیچھے کیا۔

''اندر تو چلو سب بتاتا ہوں بارش کی وجہ سے ہم بھی پوری طرح بھیگ چکے ہیں اور تمھارا شاپنگ کا سارا سامان بھی'' اُس نے ایک بار پھر ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے سامان کی کوئی پرواہ نہیں اور جہاں تک بات ہماری ہے تو تم بائیک سے اُس وقت تک نہیں اُترو گے جب تک ساری بات نہیں بتا دیتے''۔

''جنت تمھیں بارش بہت پسند ہے نہ تو پھر میں آج اس بارش کے ایک ایک قطرے کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کے

میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں آج سے نہیں بچپن سے میں تمھیں اُس وقت سے پسند کرتا ہوں جب مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کے محبت ہوتی کیا ہے اور سچ کہوں تو میں آج بھی محبت کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کے جس طرح بچپن کی شرارتیں اور لڑکپن کی شیطانیاں ہم نے ساتھ ساتھ سرانجام دی ہیں اسی طرح میں اپنی پوری زندگی تمھارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور تمھارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا''۔

عمر اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور وہ جو کچھ دیر پہلے قینچی کی طرح زبان چلا رہی تھی ابھی کسی پتھر کی مانند کھڑی سُن رہی تھی۔

''جب مجھے پہلی بار احساس ہوا تو میں چاہتا تھا کے اُڑ کر تمھارے پاس جاؤں اور تمھیں اپنے خیالات سے آگاہ کر دوں لیکن اگلے ہی لمحے میرے سارے جذبات دم توڑ گئے جب میں نے امی اور دادی کو بات کرتے ہوئے سُنا کے دادا جان نے بچپن میں ہی تمھاری منگنی کر دی تھی اور بہت جلد تمھاری شادی بھی کر دی جائے گی''۔

''کیا میری شادی'' اچانک زور سے بادل گرجنے کی آواز آئی منگنی کی بات سُن کر جنت کو ایسے لگا جیسے اُس پر کوئی بجلی سی گر گئی ہو۔

''ہاں یہ سچ ہے اور بقول امی کے اُن کے فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا اس لیئے میں جان بوجھ کر اگنور کرتا رہا تا کہ تمھیں بھلا سکوں لیکن پھر تم اُس دن میرے سامنے آ گئی اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی تمھارے ساتھ بدتمیزی کرنی پڑی''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے عمر بچپن کی منگنی اور شادی یہ سب باتیں دیہاتوں میں ہوتیں ہیں جبکہ ہماری فیملی تو بہت ماڈرن ہے'' اُسے عمر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جب میں نے پہلی بار سُنا تھا تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن ہمارے یقین نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدلے گی''۔

''ایسے کس طرح وہ میری مرضی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر سکتے ہیں''۔

''بڑوں نے فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا'' اُس نے سسپینس بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمھیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا'' اُس نے نم آنکھوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

”اس کہ بعد تو میری پوری زندگی ہی بدل جائے گی لیکن میں اپنے بڑوں کے خلاف نہیں جا سکتا“ اُس کے چہرے میں زمانے بھر کا درد سمایا ہوا تھا۔

”تمھارا تو پتا نہیں لیکن میں مر جاؤں گی مگر یہ شادی ہرگز نہیں کروں گی“ جنت غصے سے لال پیلی ہوتی ہوئی پلٹی تو عمر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تمھیں موت تو قبول ہے لیکن زندگی کے اس طویل سفر میں عمر فراز کا ہمسفر بننا قبول نہیں“ جنت نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو عمر تمام تر خباثتوں کہ ساتھ مسکرا رہا تھا۔

”تو اس کا مطلب کہ تم......“ آج اُس پر حیرت کے پے در پے وار ہوئے تھے ماضی کے وہ راز جن سے وہ نا آشنا تھی آج پوری طرح کھل کر اُس کے سامنے آ چکے تھے۔

”جواب تو دیتی جاؤ“ وہ ہاتھ چھڑا کر جانے لگی تو عمر نے شوخی بھرے انداز میں پوچھا۔

”قبول ہے“ اُس نے ہلکی سی آواز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی اور عمر وہیں بارش میں موٹر سائیکل پر بیٹھا چہرے پر مسکراہٹ لیے اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہا۔

☆......☆......☆

”آج بڑے بجھے بجھے سے لگ رہے ہو کیا کوئی پریشانی ہے“ رات کو کھانا کھانے کے بعد محمود صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے اور احمد اور زینب لان میں ٹہلنے لگے۔

”کچھ نہیں کل میں اپنے گھر گیا تھا“۔

”تو......؟“ اُس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”اس سے پہلے کے میں گھر والوں سے تمھارا ذکر کرتا اماں نے بتایا کے اُنھوں نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے“ اُس نے وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر تم نے کیا کہا؟“ وہ بھی اُس کا جواب جاننے کے لیے بیتاب تھی۔

”جب اُنھوں نے سب کچھ کہہ دیا ہے تو پھر میرے کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے“ اُس نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک بار بات تو کر کے دیکھو شاید وہ مان جائیں'' وہ بھی اُس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''میں اپنے گھر والوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اب کبھی بھی ہماری شادی کے لیئے تیار نہیں ہونگے''۔

''تو پھر اب کیا ہوگا'' اُسے اپنے مستقبل کی فکر ہونے لگی تھی۔

''کچھ سمجھ نہیں آ رہا کے میں کیا کروں'' اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اگر میری مانو تو......ہم دونوں کورٹ میرج کر لیتے ہیں'' اُس نے آسان ساحل بیان کرتے ہوئے کہا۔

''زینب میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اپنے گھر والوں کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتا''۔

''احمد وہ تمھارے ماں باپ ہیں کتنی دیر تم سے ناراض رہیں گے ایک نہ ایک دن معاف کر دیں گے''۔

''نہیں میں یہ نہیں کر سکتا تم جانتی ہو ہماری اس حرکت سے ہمارے خاندان والوں کی کتنی بدنامی ہوگی اور تمھارے پاپا اُن کی کیا عزت باقی رہ جائے گی'' اُسے محمود صاحب کی عزت بھی عزیز تھی۔

''تو پھر ایک ہی راستہ ہے میں خود بابا جان سے بات کرتی ہوں''۔

''کیا تمھیں پورا یقین ہے کے وہ مان جائیں گے'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے زینب کی طرف دیکھا۔

''ہاں مجھے پورا یقین ہے وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے''۔

''تو پھر ٹھیک ہے چلو اللہ کا نام لے کر ابھی بات کر لیتے ہیں''۔

☆......☆......☆

محمود صاحب سٹڈی روم میں بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ'' اُنھیں نے ایک پل کو کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

''بابا ہم دونوں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''ہاں بیٹا کہو کیا کہنا چاہتے ہو''۔

''جی......سر......وہ......'' احمد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح بات کرے۔

’’بابا......اصل میں ہمیں آپ سے بات کرنی تھی‘‘ زینب نے بھی بات کرنے کی کوشش کی۔

’’ہاں بیٹا سُن رہا ہوں بولو کیا بات ہے‘‘۔

’’بابا ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں‘‘ بالآخر اُس نے ہمت کر کہ بول ہی دیا تھا۔

’’کیا......واقعی...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے‘‘ محمود سے ایسے رویہ کی احمد کو بالکل اُمید نہیں تھی۔

’’جی......سر‘‘ احمد نے بھی ہمت دکھائی۔

’’سچ کہوں تو بیٹا تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے اصل میں خود یہی چاہتا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تم دونوں سے کیسے بات کروں میں اس کشمکش میں تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہو یا نہیں‘‘۔

’’تو سر اس کا مطلب آپ کو ہماری شادی سے کوئی اعتراض نہیں‘‘ اُس نے تسلی کرنے کے لیے پوچھا۔

’’ہاں بھئی مجھے کوئی اعتراض نہیں تم ایسا کرو کہ کل ہی اپنے ماں باپ کو زینب کے رشتے کے لیے یہاں لے آؤ‘‘۔

’’بابا اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ احمد کے ماں باپ نے زبردستی اُس کی شادی کہیں اور طے کر دی ہے اس لیے وہ اس شادی کے لیے کبھی راضی نہیں ہونگے‘‘ زینب نے اُنھیں ساری صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا ماں باپ کے لیے اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی میں اُن سے بات کرتا ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے‘‘۔

’’نہیں سر میرے ابا اپنی ضد کے بہت پکے ہیں وہ زبان کی خاطر جان بھی دے سکتے ہیں اس لیے وہ اپنا فیصلہ کبھی بھی نہیں بدلیں گے‘‘ احمد نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

’’تو اس کا مطلب تم اپنے ماں باپ کی دعاؤں کے بغیر شادی کرنا چاہتے ہو‘‘ محمود صاحب کو اُس کے فیصلے پر تشویش ہوئی۔

’’کرنا تو نہیں چاہتا لیکن کیا کر سکتے ہیں مجھے اس سب پر مجبور کرنے والے بھی وہی ہیں‘‘۔

’’بابا آپ فکر نہیں کریں شادی کے بعد ہم اُن سے ملنے چلے جائیں گے ایک بار شادی ہو گئی تو پھر وہ مان ہی

جائیں گے'' زینب نے محمود صاحب کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔

''تو پھر ٹھیک ہے اگر تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو اگلے ہفتے ہی تمھاری شادی کا بندوبست کر دیتے ہیں'' اُن دونوں کی یقین دہانی کے بعد محمود صاحب احمد اور زینب کی شادی کے لیے رضا مند ہو گئے اور کچھ ہی دنوں میں بڑی دھوم دھام سے احمد اور زینب کی شادی ہو گئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد احمد کو کمپنی کہ کام سے امریکہ جانا پڑا تو محمود صاحب نے زینب کو بھی اُس کے ساتھ بھیج دیا۔

☆......☆......☆

شام کو آفس سے آنے کے بعد احمد اور زینب بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کے دروازے پر دستک ہوئی' ملازمہ اس وقت کچن میں مصروف تھی اس لیئے دروازہ کھولنے کے لیئے احمد کو ہی جانا پڑا۔ احمد نے دروازہ کھولا تو سامنے فراز کو دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔

''بھائی...... آپ...... یہاں'' احمد نے بمشکل اٹک اٹک کر کہا۔

''ہاں میں یہاں کیوں مجھے یہاں دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی''۔

''نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ اندر آئیں...... بھائی آپ یہاں بیٹھیئے میں آپ کے لیئے جوس لے کر آتا ہوں'' احمد نے صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جوس کو دفعہ کرو یہ بتاؤ کہاں غائب تھے تم نہ کوئی خبر نہ کوئی پتا میں نے کئی بار تمھارے فلیٹ کے چکر لگائے لیکن جب بھی یہاں آیا تالا ہی لگا ہوا پایا اور تمھاری کمپنی سے پتا چلا کے تم اس ملک میں ہی نہیں ہو تمھیں پتا بھی ہے کے تمھارے لیئے ہم سب کتنے پریشان تھے'' فراز کے لہجے میں سخت غصہ تھا۔

''جی بھائی وہ کمپنی کے ایک ضروری کام سے مجھے امریکہ جانا پڑ گیا تھا اور ایمرجنسی میں جانا پڑا اس لیئے آپ کو بتانے کا وقت ہی نہیں ملا ابھی کل ہی میں پاکستان واپس آیا ہوں اور ایک دو دن میں گھر آنے ہی والا تھا'' احمد نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب آ ہی گئے ہو تو ایک بار جا کر اماں سے مل لو وہ بہت پریشان ہیں تمھارے لیئے بلکہ تم ایسے کرو کے تم ابھی میرے ساتھ چلو''۔

''بھائی آج تو میں نہیں جا سکتا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کے میں کل ضرور ملنے آؤں گا'' گھر والوں کا سامنا کرنے کی اُس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''کیوں یہاں تم اکیلے کیا کرو گے چلو میرے ساتھ گھر چلو'' ۔فراز بھائی نے ذرا اُونچی آواز میں کہا یقیناً اُن کے خیال میں احمد گھر میں اکیلا تھا۔

شور کی آواز سُن کر زینب بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی جب فراز کی نظر زینب پر پڑی تو اُنھوں نے احمد کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''بھائی یہ......زینب ہے......میری......میری بیوی''۔

احمد کی بات سُن کر فراز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اُنھیں ایک پل کے لیئے یقین ہی نہیں آیا کے احمد اتنا بڑا اقدم بھی اُٹھا سکتا ہے۔

''بھائی میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن اماں نے میری شادی فزا سے طے کر دی تھی اس لیئے مجھے......'' احمد اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا لیکن فراز نے کچھ سُنے بغیر ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے گال پر جھڑ دیا اور غصے میں گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''احمد یہاں اس طرح پریشان ہونے سے بہتر ہے کے تمھارے گھر چلتے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا'' زینب نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو اب ہمیں چلنا چاہیے'' آج احمد کو گھر جانا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کے شادی کی بات سُن کر گھر والوں کا کیا ردعمل ہوگا اسی پریشانی کی وجہ سے وہ ساری رات سو نہ سکا تھا۔اُسے فراز بھائی سے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی لیکن اگر اُنھوں نے ایسا کیا تھا تو ابا کی طرف سے تو اُسے دس گنا شدید ردعمل کی اُمید تھی۔

جیسے جیسے گھر نزدیک آ رہا تھا احمد کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔گرمی اتنی زیادہ بھی نہیں تھی لیکن خوف کے مارے اُس کے پسینے چھوٹ رہے تھے اب تک تو اُس کا رومال بھی بری طرح بھیگ چکا تھا۔جب وہ دونوں

گھر پہنچے تو گھر میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ احمد یہ سوچ کر آیا تھا کے گھر والے اُسے بُرا بھلا کہے گے لیکن یہاں تو کوئی اُس سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ابا اُسے دیکھتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے اور اماں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اماں یہ زینب ہے میری بیوی اور آپ کی بہو" اماں نے ایک سرسری سی نظر اُس پر ڈالی' کھلے ہوئے بال اور دوپٹہ سر پر لینے کی بجائے گردن میں لٹکا ہوا تھا جس زینب کو احمد پہلی نظر دیکھتے ہی اُس کا دیوانہ ہو گیا تھا اماں کو وہ بالکل بھی پسند نہیں آئی۔

"اماں آپ ہی تو کہتی تھیں کے شادی کرلو تو پھر آپ کیوں ناراض ہیں"۔

"بیٹا میں نے شادی کرنے کے لیئے ضرور کہا تھا لیکن یہ نہیں کہا تھا کے تم اس طرح چھپ کر شادی کر لو تم جانتے بھی ہو کے تمھاری اس حرکت سے ہماری کتنی بے عزتی ہوئی ہے میں نے تمھیں اچھی طرح سمجھایا تھا کے ہم لوگ فزا کے گھر والوں کو زبان دے چکے ہیں اب ہم کیا جواب دیں گے" اماں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اماں مجھے معاف کر دیں" احمد نے اماں کے سامنے دوزانوں ہوتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو کام کیا ہے اُس کے بعد تو ہم تمھاری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے لیکن شکریہ ادا کرو اپنی بھابی کا جس کی بہن کو تم نے ٹھکرا دیا اُسی نے ہم کو قسم دی تھی کے ہم تمھیں کچھ نہ کہیں اسی لیئے اب چلے جاؤ اور دوبارہ مت آنا" اماں نے اُسے کوستے ہوئے کہا۔

"بھائی آپ ہی اماں کو سمجھائیں کے مجھے معاف کر دیں" احمد باری باری سب کے پاس جا رہا تھا اور زینب ایک طرف کھڑی تھی۔

"احمد تمھارے ساتھ میں بھی اماں کا گنہگار ہوں اگر میں نے ہر کام میں تمھاری حمایت نہ کی ہوتی تو شاید آج اتنا بڑا کام کرنے کی تمھاری ہمت نہ ہوتی" فراز بھائی بھی یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔

"بھابی آپ تو مجھے معاف کر دیں" بھابھی کے علاوہ سب اندر جا چکے تھے۔

"احمد بھائی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے اور گھر والے بھی آپ سے صرف اس لیئے ناراض ہیں کے

آپ نے اپنی خوشی میں اُنھیں شامل نہیں کیا''۔

''بھابھی میں نے گھر والوں کو اس لیے نہیں بتایا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے تیار نہیں ہونگے'' اُس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''بھائی آپ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا اگر آپ یہ بتا دیتے کہ آپ زینب سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو گھر والے کبھی انکار نہیں کرتے کیونکہ اولاد کی خوشی سے بڑھ کر ماں باپ کے لیے کچھ نہیں ہوتا......زبان بھی نہیں'' بھابھی نے اُسے اپنی غلطی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

''بھابی میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کے آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے جس لڑکی کو ٹھکرایا وہ آپ کی بہن ہے......'' وہ شرم سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

''احمد بھائی میری دادی کہا کرتی تھی کے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور یہ بات فزا بھی بہت اچھی طرح جانتی ہے یقیناً وہ بھی آپ سے ناراض نہیں ہوگی آپ پریشان نہ ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو بہت جلد سب آپ کو معاف کر دیں گے'' بھابھی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

بھابی کی باتوں سے اُسے ایک نئی اُمید ہوئی تھی اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کے وہ بار بار اپنے گھر والوں سے معافی مانگتا رہے گا آخر ایک نہ ایک دن تو وہ ضرور اُسے معاف کر دیں گے۔

☆......☆......☆

''جنت یہ کیا تم اب تک تیار نہیں ہوئی'' ماما اُسے بلانے آئیں تو وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔

''ماما مجھے ابھی دیر لگے گی آپ ایسا کریں کہ آپ لوگ جائیں میں بعد میں آجاؤں گی''۔

''بیٹا تم اکیلے کیسے آؤ گی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم سب ساتھ چلیں گے''۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں نے عمر کو فون کر دیا ہے وہ آتا ہی ہوگا''۔

''کیا عمر بھی تمھارے ساتھ شادی میں جائے گا......؟'' ماما نے سوالیہ نگاہوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

''جی ماما میں نے کہا تو تھا لیکن وہ کہہ رہا تھا کے صرف مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آجائے گا'' جنت نے الماری سے بلو کلر کا سوٹ نکالا اور بیڈ پر رکھ دیا۔

’’کوئی ضرورت نہیں ہے عمر کے ساتھ جانے کی تم تیار ہو کر نیچے آجاؤ ہم تمھارا انتظار کر رہے ہیں‘‘ ماما نے سخت انداز میں کہا۔

’’کیوں ماما عمر کے ساتھ جانے میں کیا مسئلہ ہے‘‘ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

’’جنت دیکھو بیٹا اب تم لوگ بڑے ہو گئے ہو اس طرح ہر وقت عمر کے ساتھ گھومنا اچھی بات نہیں ہے ‘‘اُنھوں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

’’ماما اُس دن جب مجھے شاپنگ کے لیے جانا تھا تو آپ نے ہی عمر کو میرے ساتھ بھیجا تھا اور اس کے علاوہ وہ اکثر مجھے کالج چھوڑنے جاتا ہے تب تو آپ کچھ نہیں کہتی تو پھر آج ایسا کیا ہو گیا‘‘ اُسے ماما کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

’’جنت میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یہاں سب لوگ ہمیں جانتے ہیں لیکن جس جگہ تم جا رہی ہو وہاں کوئی بھی نہیں جانتا کہ عمر تمھارا کزن ہے اور جب وہ تمھیں عمر کے ساتھ دیکھیں گے تو طرح طرح کی باتیں بنائیں گے‘‘۔

’’ماما لوگ کیا کہتے ہیں مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں اور ویسے بھی عمر میرا کزن ہے میرا دوست ہے اور......‘‘

’’اور......‘‘ ماما نے معنی خیز نظروں سے جنت کی طرف دیکھا۔

’’کچھ نہیں...... ماما آپ پلیز جائیں پاپا آپ کا انتظار کر رہے ہونگے‘‘ جنت نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

’’شاباش بیٹا تم سے یہی اُمید تھی ویسے بھی تم پہلے کبھی میری بات مانی ہے جو آج مانو گی‘‘ وہ اپنے پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئیں اور جنت پھر سے تیاری میں مصروف ہو گئی۔

☆......☆......☆

’’اماں کیا آپ لوگ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے‘‘ وہ پچھلے ایک سال سے ہر ہفتے گھر آتا تھا اماں تو پھر بھی اُس سے بات کر لیتی تھیں لیکن ابا تو اُس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔

’’بیٹا میں تو ایک ماں ہوں میں تو تمھیں کب کا معاف کر چکی ہوں‘‘۔

''تو ابا مجھے کیوں معاف نہیں کر دیتے وہ کیوں مجھ سے بات نہیں کرتے آخر میرا قصور کیا ہے صرف یہی کے میں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی''۔

''احمد ماں باپ اپنے بچوں کے لیئے ہر دکھ ہر تکلیف برداشت کر لیتے ہیں اگر ایک ماں بچے کو جنم دیتی ہے تو باپ اُس بچے کو اپنا نام دیتا ہے اُسے کھانے کے لیئے روٹی پہننے کے لیئے کپڑے اور اُس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت پوری کرتا ہے لیکن جب اولاد کھلے عام ماں باپ کی نافرمانی کرتی ہے تو اُنھیں ایسا لگتا ہے کے جیسے اُن کی ساری محنت بے کار ہو گئی اور وہ اپنے بچے کی اچھی پرورش کرنے میں ناکام ہو گئے'' اماں کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ ابھی بھی اُس کی حرکت کی وجہ سے رنجیدہ ہیں۔

''اماں میں مانتا ہوں کے میں نے بہت بڑی غلطی کی لیکن یہ آپ کی اچھی پرورش کا ہی نتیجہ ہے کے میں اب تک آپ سے معافی مانگ رہا ہوں اگر آپ نے میری اچھی پرورش نہ کی ہوتی تو میں آپ کے لوگوں کے سخت رویے کے باوجود ہر ہفتے یہاں نہ آتا'' وہ اماں کے سامنے دوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔

''میں جانتی ہوں کے تم اپنی حرکت پر پشیمان ہو اور اسی لیے میں نے تمھیں معاف بھی کر دیا ہے''۔

''تو پھر یہ پشیمانی ابا جان کو کیوں نظر نہیں آتی، اماں ایک سال گذر چکا ہے لیکن ابا نے اب تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی میرا دل جلتا ہے جب وہ آپ سب سے مسکرا کر باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہی اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر میں ایسا کیا کروں جس سے ابا کی ناراضی ختم ہو جائے'' اُس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''میں نے تو تمھارے ابا کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن وہ اپنی ضد چھورنے کو تیار ہی نہیں''۔

''بس اماں اب میری برداشت کی حد ہو چکی ہے اگر ابا ضد کر سکتے ہیں تو میں بھی اُن کا ہی بیٹا ہوں اُن سے کہہ دیجئے گا کہ اگر اب بھی اُنھوں نے مجھے معاف نہ کیا تو میں اپنی جان دے دوں گا'' احمد غصے میں کہہ کر باہر چلا گیا اماں آوازیں دیتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''جنت جلدی کرو اور کتنا انتظار کرواؤ گی'' عمر انتظار کرتے کرتے تھک چکا تھا وہ پچھلے پندرہ منٹ سے ہارن

بجا رہا تھا۔

''آ رہی ہوں'' جنت نے دروازے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''کیسی لگ رہی ہوں''۔

''اچھی لگ رہی ہو'' عمر نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''عمر تمھیں تو ٹھیک سے تعریف کرنا بھی نہیں آتا'' اُس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''تعریف تو اُس پاک پروردگار کی جس نے یہ چاند سا چہرہ بنایا ویسے تم لڑکیاں تعریف کی اتنی بھوکی کیوں ہوتی ہو کیوں یہ چاہتی ہو کہ سامنے والا ہر وقت تم پر تعریفوں کے پھول نچھاور کرتا رہے جبکہ حقیقت میں تو تعریف کے قابل صرف اللہ کی ذات جس نے تمھیں اچھی صورت عطا کی''۔

''بے شک تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیئے ہی ہیں لیکن مخلوق کی تعریف بھی خالق کی ہی تعریف ہے'' اُس نے چہرے کے سامنے آئی لٹ کو ہٹایا۔

'جنت میری ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ انسان کی تعریف اُس کے اچھے اخلاق' اچھی سیرت کی وجہ سے کرنی چاہیے نہ کے اس کی اچھی شکل وصورت کی وجہ سے کیوں کے جسمانی خوبصورتی تو عارضی ہوتی ہے لیکن انسان اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتا ہے'' وہ اُسے سمجھا رہا تھا لیکن وہ لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''اچھا اب یہاں کھڑے لیکچر ہی دیتے رہو گے یا چلو گے بھی ہمیں دیر ہو رہی ہے''۔

''تو پھر بیٹھو انتظار کس کا ہے''۔

''تمھارا انٹرویو تھا نہ آج اُس کا کیا ہوا'' اُس نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہی جو روز ہوتا ہے'' عمر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے دھواں اُڑاتا ہوا چلا گیا۔

☆......☆......☆

پچھلے ایک سال میں بہت کچھ بدل چکا تھا احمد اب ایک بیٹی کا باپ بن گیا تھا اور محمود صاحب اس دنیا فانی کو چھوڑ کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے' اُن کے جانے کے بعد احمد اور زینب اپنا فلیٹ چھوڑ کر واپس بنگلے میں آ

گئے تھے اور کاروبار کی ساری ذمہ داری احمد نے اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ اتنے وسیع کاروبار کو سنبھالنا اُس کے لیئے مشکل ہوتا تھا اس لیئے زینب نے بھی آفس جوائن کر لیا۔ احمد بارہا اپنی غلطی کی معافی مانگ چکا تھا لیکن گھر والے اب تک اُس سے ناراض تھے باقی سب تو پھر بھی بات کر لیتے تھے لیکن ابا تو اُس کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے اور جا کر اپنے کمرے میں گھس جاتے اور احمد کے جانے کے بعد ہی باہر اپنے کمرے سے باہر آتے۔

ایک دن احمد دو ماہ کی جنت کو گود میں اُٹھائے اُس کے ساتھ کھیل رہا تھا کے اچانک اُس کے دماغ میں خیال آیا کے کیوں نہ وہ جنت کو گھر لے کے جائے شاید اسی طرح ابا سب کچھ بھلا کر اُسے گلے سے لگا لیں کیوں کے ابا کی بڑی خواہش تھی کے اُن کی بیٹی ہو۔

(ایک وقت تھا جب لوگ بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے اور مائیں دعا کرتی تھیں کے اُن کے گھر بیٹی پیدا نہ ہو لیکن ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی آمد کے بعد جاہلیت کے اندھیرے چھٹ گئے اور ہر طرف نور کا اُجالا ہو گیا' لوگ بیٹی کو زحمت کی بجائے رحمت سمجھنے لگے اور یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کی ہی نتیجہ ہے کے کسی زمانے میں باپ اپنے ہاتھوں اپنی بیٹیوں کو درگور کرتے تھے آج وہی باپ ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے بیٹی مانگتے ہیں)۔

''زینب چلو تیار ہو جاؤ ہمیں گھر جانا ہے'' اُس نے جنت کو اُٹھایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''احمد ہم جتنی بار بھی وہاں گئے ہیں بے عزتی کے علاوہ کچھ نہیں ملا اگر تمھیں بے عزتی کروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم جاؤ میں نہیں جا سکتی ویسے بھی سارا دن آفس میں کام کرتے کرتے تھک چکی ہوں'' زینب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

احمد نے بحث کرنے کی بجائے جنت کو اپنے ساتھ لیا اور زینب کے بغیر ہی گھر چلا گیا۔

معمول کے مطابق ابا اُسے دیکھتے ہی واپس جانے لگے تو احمد اُن کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''ابا میں جانتا ہوں کے آپ مجھ سے ناراض ہیں اور شاید کبھی بھی مجھے معاف نہیں کریں گے لیکن یہ میری بیٹی ہے آپ کی پوتی ہے آپ میری غلطی کے سزا اس معصوم بچی کو تو نہ دیں' جتنی محبت آپ عمر سے کرتے ہیں یہ بھی آپ کی محبت کی اُتنی ہی حق دار ہے'' ابا نے جنت کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی ابا نے

جنت کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔احمد نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ابا کبھی جنت کے ننھے ننھے ہاتھوں کو چومتے تو کبھی اُس کے چہرے کو پیار کرتے آج اُن کی خوشی دیدنی تھی احمد بھی بہت خوش تھا کے اُس کا یہ تجربہ کام کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

''حد ہوگئی ہے یار یہ عمر ابھی تک نہیں آیا'' حسن نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا

''آتا ہوگا یار آج اُس کا انٹرویو تھا اس لیے لیٹ ہو گیا ہوگا'' آزاد نے چہرے کے آگے سے اخبار ہٹاتے ہوئے کہا۔

''اُس کے ساتھ بھی انٹریو میں وہی ہوگا جو ہمارے ساتھ ہو چُکا ہے انٹرویو بہت اچھا ہوا ہوگا لیکن آخرکار نوکری کسی وزیر یا کسی بڑے افسر کے بھائی بیٹے یا کسی رشتے دار کو مل جائے گی اور وہ منہ لٹکا کے آجائے گا''۔

''حسن اللہ پاک سے اچھی اُمید رکھو یار اور ویسے بھی مایوسی گُناہ ہے'' آزاد نے اُسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''سوری یار آزاد لیکن میں تنگ آ گیا ہوں انٹرویو دیدے کہ ایک سال سے ہم انٹرویو دے رہے ہیں لیکن اب تک کوئی جاب نہیں ملی پتہ نہیں کب ملے گی یہ جاب حسن نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا''۔

''اگر اللہ نے چاہا تو مل جائے گی اللہ کرے آج سے ہماری کامیابی کے دن شروع ہو جائیں اور عمر کو جاب مل جائے آزاد نے اُمید ظاہر کرتے ہوئے کہا''۔

''وہ دیکھو آرہا ہے عمر اُسی سے پوچھ لیتے ہیں'' حسن نے عمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا جاب مل گئی یا آج بھی قسمت کی دیوی ہم سے روٹھی ہوئی ہے'' حسن جاننے کے لیئے بڑا بے تاب تھا۔

''نہیں یار انٹرویو ہوا ہی نہیں...... جاب کسی گورنمنٹ آفیسر کے بھائی کو دے دی گئی ہے''۔

''مجھے پہلے ہی پتا تھا اس مُلک میں جاب ملنا بہت مشکل ہے یہاں اچھی جاب حاصل کرنے کہ لیے یا تو رشوت ہونی چاہیے یا سفارش جس کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں اُس کو جاب نہیں ملے گی چاہے کتنی ہی قابلیت کیوں نہ ہو'' حسن نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

حسن کی بات سُن کر عمر اور آزاد بھی لاجواب ہو گئے کیونکہ ایک سال سے وہ بھی یہ دیکھ رہے تھے کہ واقعی پاکستان میں رشوت یا سفارش کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

''اچھا یار نوکری نہیں ملی تو کیا ہوا ہم کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد آزاد نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''اور کاروبار کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے'' حسن نے سوالیہ نگاہوں سے آزاد کی طرف دیکھا۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں یار'' آزاد کے منہ پر جو چمک آئی تھی حسن کی بات سُن کر پھر سے ماند پڑ گئی۔

''پھر کیا کریں ایک سال ہو گیا نوکری کے لیئے مارے مارے پھر رہے ہیں اب تو گھر والے بھی ہماری بیروزگاری سے تنگ آ گئے ہیں'' حسن نے پریشان ہو کر کہا۔

''ویسے کیا تم لوگ جانتے ہو وزیر اعلیٰ پنجاب نے بیروزگار لڑکوں کے لیئے ٹیکسی سکیم بھی متعارف کروائی ہے'' آزاد نے ایک اور مشورہ دیا۔

''تو تمھارا کیا خیال ہے ہم اب ٹیکسی چلانا شروع شروع کر دیں' میرا ایک کزن آٹھویں فیل ہے وہ بھی ٹیکسی چلاتا ہے اگر اُس نے مجھے ٹیکسی چلاتے دیکھا تو کتنی بے عزتی ہو گی'' حسن کو اپنی ناک بھی بہت پیاری تھی۔

''کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کے تم ٹیکسی چلا رہے ہو''۔

''وہ کیسے'' حسن کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

''وہ اس طرح کے ہم بھی وہی کریں گے جو سب کرتے ہیں بینک سے ٹیکسی لیں گے پھر کسی پینٹر سے اپنی پسند کا رنگ کروا لیں گے اگر کوئی جان پہچان والا دیکھ بھی لے تو اُسے تو یہی لگے کے ہم اپنی کار چلا رہے ہیں''۔

''خیال تو تمھارا بہت اچھا ہے لیکن شائد تم یہ نہیں جانتے کے اُس سکیم کے لیئے پہلے ہی ہزاروں لڑکوں نے اپلائی کیا ہو گا اور اگر تم چاہتے ہو کہ ہزاروں لوگوں میں سے یہ گاڑی تمھارے حصے آئے تو اُس کے لیئے بھی تمھیں پہلے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے کسی افسر کو کھلانے پڑیں گے'' عمر نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا جو اب تک اُن دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔

''اچھا یہ دیکھو اخبار میں خبر چھپی ہے کہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں نوکریاں موجود ہیں'' آزاد نے اُنھیں اخبار

دکھاتے ہوئے کہا۔

''جہاں اتنے انٹرویو دیئے ہیں کل یہ بھی دے کے دیکھ لیتے ہیں اگر کل بھی نوکری نہ ملی تو پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے'' عمر نے مشورہ دیا۔

''اگر تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے پھر کل چلتے ہیں'' حسن بھی مان گیا۔

☆......☆......☆

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا جنت کا انتظار کر رہا تھا۔اچانک اُس کی نظر دور سے آتی جنت پر پڑی تو وہ ایک پل کے لیے ساری پریشانی بھول گیا۔جنت نے آج عمر کا فیورٹ سُرخ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔عمر کو وہ ویسے بھی بہت اچھی لگتی تھی لیکن سُرخ رنگ کے کپڑوں میں تو کسی حور یا پری کی مانند لگتی تھی۔

''کیسے ہو عمر......آج تو تمھارا انٹرویو تھا نہ'' اُس نے آتے ہی عمر سے سوال کیا۔

''ہاں گیا تھا ابھی وہیں سے آرہا ہوں'' عمر نے جواب دیا۔

''کیسا رہا انٹرویو کیا لگتا ہے جاب مل جائے گی''۔

''نہیں'' عمر نے نفی میں سر ہلایا۔

یہ سُن کر جنت کو بڑی مایوسی ہوئی آج پھر اُس کے سپنوں پر اوس پڑ گئی تھی۔اُس نے عمر سے شادی اور اُس کے ساتھ سُنہرے مستقبل کے خواب دیکھے تھے لیکن وہ خواب تب تک پورے نہیں ہو سکتے تھے جب تک کے عمر کو نوکری نہ مل جائے۔

''مجھے لگتا ہے عمر کے ہماری شادی کبھی نہیں ہوسکتی کیونکہ نہ تم جاب کرو گے اور نہ ہماری شادی ہو گی'' جنت نے بڑے ہی غمگین لہجے میں کہا۔

''خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو جنت''۔

''تو اور کیا بات کروں کب سے تم کوشش کر رہے ہو لیکن تمھیں نوکری ہی نہیں مل رہی اگر ایسے ہی چلتا رہا تو کیسے ہو گی ہماری شادی'' جنت تو جیسے رونے ہی لگی تھی۔

''اگر بات صرف نوکری کی ہے نہ تو میں تمھارے لیئے کسی ہوٹل میں ویٹر کی نوکری بھی کرسکتا ہوں لیکن میں تمھارے لیئے ایک گھر بنانا چاہتا ہوں جنت جیسا گھر جس میں دنیا کی ہر سہولت موجود ہو اور تم جو چاہو وہ آنکھ جھپکنے سے پہلے تمھارے سامنے ہو اور جہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہو اس لیئے میں کسی اچھی نوکری کی تلاش کر رہا ہوں''۔عمر نے جنت کو اپنی محبت کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

''عمر یہ حقیقی زندگی ہے کوئی ڈرامہ یا فلم نہیں کے اگلے لمحے نظارہ بدلے اور تم امیر ہو جاؤ اور یہ جو جنت جیسا گھر بنانے کی تم باتیں کر رہے ہو نا اُس کے لیئے اگر ساری زندگی دن رات کام بھی کرو گے پھر بھی تم جنت نہیں بنا سکتے کیوں کے ہم انسان ہیں اور انسان کی فطرت ہے کے کسی بھی حال میں خوش نہیں ہوتا اور اگر پیسے سے سکون ملتا نہ تو آج کوئی بھی امیر بے چین نہیں ہوتا بلکہ جس انسان کے پاس جتنا زیادہ پیسہ ہو نا وہ اُتنا ہی پریشان اور بے قرار رہتا ہے''۔

''تو تم کیا چاہتی ہو کے میں یہ دس ہزار والی نوکری جوئن کرلوں'' اُس نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

''اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو تم کم از کم پاپا کی کمپنی جوائن کر لو میں نے اُن سے بات کی تھی وہ کہہ رہے تھے کے اچھا ہے اگر عمر کمپنی جوئن کر لے ویسے بھی کل کو سارا کاروبار اُسے ہی تو سنبھالنا ہے''۔

''جنت میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں کسی اور کے کندھوں پر قدم رکھ کر مجھے اپنا قد بڑا کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔

''تو پھر ٹھیک اب میرے سامنے اُسی وقت آنا جب اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تب تک مجھ سے بات بھی نہیں کرنا اور ہاں آج شام کو ماما اور پاپا تمھارے گھر جانے والے ہیں''۔

''وہ کیوں آرہے ہیں'' عمر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا کیوں''...... جنت نے بڑی بے رُخی سے جواب دیا۔

عمر یہ بات سُن کر پریشان ہو گیا اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کے انکل آنٹی کیوں آرہے ہیں۔

☆......☆......☆

جیسے ہی حسن (عمر کا دوست) گھر میں داخل ہوا تو سامنے پڑے ہوئے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ

گیا۔

''کہاں آوارہ گردی کرنے گئے تھے''ابا جی بھی وہاں نمودار ہوئے۔

''جی...ابا انٹرویو کے لیئے گیا تھا''حسن نے جواب دیا

''اچھا تو مل گئی نوکری''اُن کے لہجے میں طنز واضع تھا۔

''نہیں ابا جان''حسن نے سر جُھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمھیں کبھی نوکری ملے گی بھی نہیں سچ تو یہ ہے کے تم نوکری کرنا ہی نہیں چاہتے بیٹا جس شخص کو آوارہ گردی اور گھومنے پھرنے کی لت لگ جائے تو اُس کا کام میں من نہیں لگتا' تمھارے بڑے بھائی نے پڑھائی ختم کی تھی تو اُسے کچھ دن بعد ہی اچھی نوکری مل گئی تھی اور ایک تم ہو ایک سال سے تمھیں نوکری ہی نہیں مل رہی''ابا جان نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شور کی آواز سُن کر امی اور بھائی بھابی بھی وہاں آ گئے۔

''ابا جان تب حالات کچھ اور تھے آجکل لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے کافی فیکٹریاں بند پڑی ہیں جس کی وجہ سے بیروزگاری بڑھ گئی ہے اس لیئے اچھی جاب ملنے میں مشکل پیش آ رہی ہے''اُس نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

''بس حالات جو بھی ہوں ایک سال تم نے اپنی مرضی کی نوکری تلاش کرنے کی کوشش کرنے میں ضائع کر دیا اس لیئے اب تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا' میں نے اپنے دفتر میں تمھاری نوکری کے لیئے بات کر لی ہے کل سے تم میرے ساتھ چلو گے''اُنھوں نے اُسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

''میں یہ جاب نہیں کروں گا میں نے اتنے سال پڑھائی اس لیئے تو نہیں کی تھی کے میں بعد میں کلرک کی نوکری کروں اگر یہی سب کرنا تھا تو یہ تو میں پہلے بھی کر سکتا تھا''۔

''بس میں اب اور کچھ نہیں سُننا چاہتا کل تم میرے ساتھ چلو گے''اُنھوں نے ایک بار پھر اپنی بات کو دہرایا۔

''لیکن ابا......''حسن کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ابا بغیر کچھ سُنے ہی وہاں سے چلے گئے۔

”بیٹا اپنے ابا کی باتوں کا بُرا مت ماننا وہ دراصل تمھیں نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں دیکھو بیٹا تمھیں خود اپنی زمہ داری کا احساس ہونا چاہیے تمھاری ایک جوان بہن ہے اُس کی شادی بھی تو کرنی ہے اور تمھارے ابا جان بھی تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں وہ کب تک اس گھر کا بوجھ اُٹھائیں گے' اس لیئے بیٹا اب تمھیں نوکری کر لینی چاہیے“ ابا کے جانے کے بعد امی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ابھی یہ نوکری کر لو یار جب تمھیں کوئی اچھی اور تمھاری مرضی کی جاب ملے گی تو چھوڑ دینا ہم تمھیں ساری زندگی یہی کام کرنے کے لیئے تو نہیں کہہ رہے ہیں“ اب بھائی نے بھی اپنا فریضہ نبھایا۔

حسن نے کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

☆......☆......☆

رات کو گھر والے کھانے کی ٹیبل پر جنت کے امی ابو کا انتظار کر رہے تھے اس دوران عمر نے کئی بار کوشش کی کے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے باہر نکل جائے لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کے کیا بہانہ کرے۔ ٹھیک آٹھ بجے انکل آنٹی گھر میں داخل ہو گئے سب گھر والے اُن لوگوں کے آنے پر بہت خوش تھے۔

”عمر بیٹا جنت بتا رہی تھی کے آج پھر تمھیں نوکری نہیں ملی“ سب کھانا شروع کرنے لگے تو زینب آنٹی نے نوکری کا ذکر چھیڑ دیا۔

یہ سُن کر عمر کو جنت پر بہت غصہ آیا ”کیا ضرورت تھی اُسے یہ بات گھر پر بتانے کی“ اُس نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔جی آنٹی انٹرویو تو بہت اچھا ہوا تھا لیکن پھر پتا نہیں کیوں نوکری نہیں ملی“۔

”بیٹا تمھیں نوکری ملتی نہیں یا تم خود نوکری نہیں کرنا چاہتے“ زینب آنٹی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کیسی بات کر رہی ہیں آنٹی میں جان بوجھ کر ایسا کیوں کروں گا“۔

”نہیں بیٹا میرا وہ مطلب نہیں تھا دراصل یہ سب تو قسمت کی بات ہوتی ہے اب دیکھو نہ ایک طرف تمھیں اتنی دیر ہو گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی اچھی نوکری نہیں ملی اور دوسری طرف اسد ہے جس نے اپنے والد کی وفات کے بعد نہ صرف کاروبار کو سنبھالا بلکہ اُسے دگنی اُونچائی پر پہنچا دیا ہے“۔

”یہ اسد کون ہے“ دادی نے پوچھا۔
”اماں اسد میرے چچازاد بھائی شہریار کا بیٹا ہے ابھی کچھ مہینے پہلے ہی شہریار بھائی کی ایک خادثے میں موت ہوگئی تھی اور اب اُن کے بعد اسد ماشاءاللہ بڑی خوش اسلوبی سے اُن کی ساری زمہ داریاں نبھا رہا ہے“ زینب آنٹی نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔
”ماشاءاللہ بہت کم خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جن کو ایسی اولاد نصیب ہوتی ہے“ دادی نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔
عمر سمجھ چکا تھا کے آنٹی یہ سب باتیں اس کا دل جلانے کے لیئے کر رہی ہیں۔
”میں بھی دن رات یہی دعا کرتی رہتی ہوں کے عمر کو کوئی اچھی نوکری مل جائے اور میں جنت کو اپنی بہو بنا کر اپنے گھر لے آؤں“۔
”معاف کیجیے گا بھابی لیکن اگر ایسا ہی چلتا رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کے ہمیں اُس کی شادی کہیں اور کرنی پڑے“ زینب آنٹی نے اب عمر کو صاف لفظوں میں دھمکی دیتے ہوئے کہا۔
”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ آخر تمھیں ضرورت کیا ہے نوکری کرنے کی اتنا بڑا کاروبار ہے اور ویسے بھی کل کو یہ سب تمھیں ہی تو سنبھالنا ہے“ انکل نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔
”انکل آپ کا بہت شکریہ لیکن میں اپنے دم پر کچھ کرنا چاہتا ہوں آپ کا کاروبار پہلے ہی بہت بڑا ہے وہاں مجھے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہیں ملے گا اس لیے میں کسی ایسی جگہ کام کرنا چاہتا ہوں جہاں مجھے اپنی قابلیت کا پتا چل سکے“۔
”مجھے واقعی ہی تمھاری باتیں سُن کر بہت خوشی ہوئی ہے عمر لیکن بیٹا ہم بھی ایک لڑکی کے پیرنٹ ہیں آئے روز لوگ ہمیں جنت کے رشتے کے لیے پوچھتے رہتے ہیں اس لیے جو بھی کرنا ہے جلدی کرو“۔
”جی آنٹی میں کوشش کر رہا ہوں انشااللہ بہت جلد اچھی نوکری مل جائے گی“ عمر کو آنٹی کی باتوں سے یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ وہ جنت کی شادی اسد سے کروانا چاہتی ہیں۔
”چلو بھئی باقی باتیں بعد میں کر لینا پہلے کھانا شروع کرو بھوک کے مارے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے

"دادی اماں نے حکم دیا تو سب خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

"تم دونوں کے کہنے پر آخری کوشش بھی کر کے دیکھ لی لیکن وہاں بھی نوکری نہیں ملی پھر اب کیا کریں" حسن دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے ہوئے تھا۔

"جتنی کل میری بے عزتی ہوئی ہے نا میرا تو دل کرتا ہے کہ کسی ٹرین کے نیچے لیٹ جاؤں اور یہ ذلت بھری زندگی ختم کر دوں" عمر نے جذباتی ہو کر کہا۔

"کیسی پاگلوں جیسی بات کر رہے ہو عمر" آزاد عمر کی بات سُن کر گھبرا گیا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اور کیا کریں کب سے ہم نوکری کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی نوکری نہیں ملی اب اور برداشت نہیں ہوتا" حسن نے بھی عمر کی حمایت کی۔

"یار اب تو جنت نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کے جب تک کوئی نوکری نہیں ملتی مجھے اپنی شکل مت دکھانا"۔

"عمر مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی میری اور حسن کی بات تو الگ ہے لیکن تم تو جنت احمد کے منگیتر ہو جن کی درجنوں فیکٹریاں ہیں اور وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے تو شادی کے بعد اُن کا سب کچھ تمھارا ہو گا تو پھر تم کیوں نوکری کے لیئے مارے مارے پھر رہے ہو جبکہ اگر تم چاہو تو تم مجھے اور حسن کو بھی اچھی نوکری دلا سکتے ہو" آزاد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یار اگر جنت میری منگیتر ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کے میں اُس کا ناجائز فائدہ اُٹھاؤں میں جنت سے محبت کرتا ہوں اور میں اُسے اپنے کمائی سے بنائے ہوئے گھر میں رکھنا چاہتا ہوں"۔

"کاش......میں تیری جگہ ہوتا تو یہ سنہری موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتا" حسن نے اپنی قسمت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہ سب اس لیئے کہہ رہے ہو کیوں کے تم نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے اگر میری آنٹی دن کو رات اور رات کو دن کہے تو میرے انکل کی اتنی ہمت نہیں ہوتی ہے وہ اُن سے کہے کے تم غلط کہہ رہی ہو اور جب

وہ غصے میں انکل سے کچھ کہہ بھی دیں تو انکل آگے سے کچھ نہیں بولتے جانتے ہو کیوں وہ اس لیئے کے وہ آنٹی کے باپ کی کمائی کھاتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کے کل کو میرے ساتھ بھی ایسا ہو' اُسے اپنی عزت نفس بھی پیاری تھی۔

''ویسا جتنا میں جنت کو جانتا ہوں میرے حساب سے تم اُس کے باپ کی کمائی کھاؤ یا وہ تمھاری کھائے حالت تمھاری بھی انکل والی ہی ہونے والی ہے'' حسن نے عمر کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''بکواس نہ کر یار'' حسن کی بات سن کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اچھا مذاق چھوڑو یار میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے یہاں تو ہمیں جاب نہیں ملی تو کیا ہوا کیوں نہ ہم کہیں اور جا کر اپنی قسمت آزمائیں'' آزاد نے مشورہ دیا۔

''کہیں اور......تم کہنا کیا چاہتے ہو'' حسن کو اُس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''یار میرا مطلب ہے کے ہم نے اب تک اپنے شہر لاہور میں ہی کوشش کی ہے لوگ تو روزگار کے لیئے دوسرے ممالک میں جا کر دھکے کھاتے ہیں تو کیوں نہ ہم کسی دوسرے شہر جا کر اپنی قسمت آزمائیں''۔

''کسی اور شہر......لیکن کہاں'' عمر نے مزید تفصیل جاننے کی کوشش کی۔

''ایسا کرتے ہیں کے ہم کراچی چلتے ہیں وہاں میرے چچازاد بھائی رہتے ہیں اس طرح ہمیں رہائش کا بھی مسئلہ نہیں ہوگا''۔

''کراچی کے حالات تو اتنے خراب ہیں کے وہاں کے رہنے والے خود دوسرے شہروں کو ہجرت کر رہے ہیں اور تو کراچی جانے کی بات کر رہا ہے''۔

''ہاں یار ٹی وی پر بھی روز ہی سُنتے رہتے ہیں کے کل فلاں جگہ ہڑتال ہوئی اور کبھی کسی دھماکے میں اتنے افراد مارے گئے اور کبھی فائرنگ سے اتنے افراد ہلاک ہو گئے'' حسن نے بھی تحفظات کا اظہار کیا۔

''کچھ نہیں ہوتا یار یہ سب میڈیا کے پھیلائے ہوئے چرچے ہیں اور میرے بھائی دس سال سے کراچی میں رہ رہے ہیں آج تک اُنھیں کچھ نہیں ہوا''۔

''کیا تمھیں یقین ہے کے کراچی میں ہمیں کوئی اچھی نوکری مل جائے گی'' عمر نے آزاد سے پوچھا۔

''مجھے پوری اُمید ہے یار کہ روشنیوں کے شہر میں جا کر ہماری قسمت پر چھایا ہوا اندھیرا بھی ختم ہو جائے گا''

”تو ٹھیک ہے پھر کب جانا ہے“حسن جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

”پہلے تم لوگ اپنے گھر والوں سے اجازت لے لو پھر ایک دو دن میں چلتے ہیں“۔

”پھر تو رہنے دے یار گھر والے کبھی اجازت نہیں دیں گے اور ابا نے تو میرے لیئے اپنے دفتر میں کلرک کی نوکری کے لیئے بات بھی کر لی ہے“اُس نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تمھارا تو مسئلہ ہی حل ہو گیا تم یہ نوکری کر لو میں اور آزاد کراچی جا کر کوئی نوکری تلاش کر لیں گے“عمر نے حسن کو طنز کرتے ہوئے کہا۔

”یار میں یہ نوکری نہیں کرنا چاہتا میرے بھی تم لوگوں کی طرح کچھ خواب ہیں جو اس چھوٹی سی نوکری سے پورے نہیں ہو سکتے“حسن نے بڑے اکھڑے سے انداز میں جواب دیا۔

”تو پھر اپنے گھر والوں سے بات کرو اور اُن کو منانے کی کوشش کرو“۔

”ٹھیک ہے یار کوشش کروں گا“۔ حسن نے آزاد سے کہہ تو دیا لیکن وہ ابھی بھی اسی سوچ میں تھا کے ابا سے کون بات کرے۔

☆......☆......☆

”کیا تم پاگل ہو گئے ہو آئے روز کراچی کے بارے میں بُری بُری خبریں سننے کو ملتی ہیں اور تم کراچی جانے کی بات کر رہے ہو“عمر نے کراچی جانے کی اجازت مانگی تو امی نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”امی وہ سب تو میڈیا کی پھیلائی ہوئیں افواہیں ہوتی ہیں آپ نے کبھی غور کیا ہے جب کسی حادثے کی خبر آتی ہے تو کسی چینل پر زخمی ہونے والوں کی تعداد بیس ہوتی ہے تو دوسرے چینل پر پچیس اور تیسرے پر تو تیس...... یہ سب تو اپنے ناظرین کی تعداد بڑھانے کے لیے ہوتا ہے“۔

”بیٹا دھواں بھی وہاں سے ہی اُٹھتا ہے جہاں آگ لگی ہو“۔

”اچھا امی چھوڑیں نہ یہ آگ دھواں آپ پلیز بابا سے بات کریں اور مجھے ایک مہینے کیلئے کراچی جانے کی اجازت دے دیں“۔

”بیٹا بابا سے بات تو میں تب کروں گی نا جب میں خود تمھیں کراچی جانے کی اجازت دوں گی“۔

''امی پلیز......صرف ایک مہینے کی تو بات ہے'' عمر نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمھیں ایک دن نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں ملتا اور تم ایک مہینے کی بات کر رہے ہو''۔

''امی کیا آپ میری خوشی کیلئے اتنا نہیں کرسکتی'' عمر نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''عمر اتنے ضدی تو تم بچپن میں بھی نہیں تھے جتنے آجکل ہو گئے ہو''۔

''پلیز امی اجازت دے دیں'' اُس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں اس بارے میں سوچوں گی لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کراچی کیوں جانا چاہتے ہو'' اُنھیں عمر کی ضد کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''امی آپ تو جانتی ہیں کہ یہاں ہر جگہ کوشش کر کے دیکھ لی لیکن کوئی نوکری نہیں ملی لیکن ایک دوست نے اُمید دلائی ہے کہ میں کراچی چلا جاؤں تو مجھے نوکری مل جائے گی''۔

''عمر بیٹا میں تمھاری امی ہوں اور جہاں تک میں تمھیں جانتی ہوں تم تو اتنی جلدی ہار نہیں مان سکتے ضرور کوئی اور بات ہے'' وہ اصل بات جاننا چاہتی تھیں۔

''نہیں امی اور تو کوئی بات نہیں ہے بس ایک سال ہو گیا ہے نوکری کی تلاش میں اور اتنی دیر میں اچھے اچھوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے'' اُس نے بات کو گول کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پیارے بچے......کم سے کم مجھ سے تو تم جھوٹ نہیں بول سکتے اس لیے جب تک تم مجھے وہ بات نہیں بتاؤ گے میں تمھارے بابا سے تمھارے لیے بات نہیں کروں گی سچ بتاؤ آخر ایسی کیا وجہ ہے جو تم نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

''دراصل امی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری وجہ سے سب کو تکلیف ہو رہی ہے''۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تمھاری وجہ سے ہمیں تکلیف ہو رہی ہے'' امی نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں امی کہ سب لوگ انتظار کرتے کرتے تھک چکے ہیں اور کل تو زینب آنٹی نے سیدھی سیدھی دھمکی ہی دیدی'' بالآخر اُس نے اصل حقیقت بیان کر ہی دی۔

''اچھا تو تم زینب کی باتوں کی وجہ سے اتنے پریشان ہو بیٹا وہ تو تمھیں چڑا رہی تھی''۔

''نہیں امی جس طرح زینب آنٹی بار بار اسد کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں مجھے لگتا ہے کہ وہ جنت کے لیئے اسد کو کنسیڈر کر رہی ہیں'' اُس نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا جہاں تک بات جنت کی شادی کی ہے تو میں نے تمھیں پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ تمھارے دادا جان کا فیصلہ ہے اور اُن کے فیصلے کو رد کر کے کوئی بھی اُن کی روح کو اذیت نہیں پہنچائے گا''۔

''ویسے امی دادی جان کو دیکھ کر اور جتنا دادا جان کے بارے میں سُنا ہے اُس سے لگتا تو نہیں کہ وہ اتنی پرانی رسموں پر یقین رکھتے ہوں گے پھر ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے دادا جان نے بچپن میں ہی میری اور جنت کی منگنی طے کر دی''۔

''یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گی ابھی رات کافی ہوگئی ہے چپ چاپ جا کہ اپنے کمرے میں سو جاؤ''۔

''امی پرسوں صبح صبح مجھے کراچی کے لیے نکلنا ہے اس لیے آج پوری رات اپنی پیاری امی سے باتیں کرتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں''۔

''واہ بیٹا ابھی اجازت ملی بھی نہیں کہ تم نے اپنا سامان بھی باندھ لیا'' امی کچن کے ساتھ منسلکہ ہال میں موجود صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''وہ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ میری خوشی کے لیے کراچی تو کیا آپ لندن جانے کی بھی اجازت دے دیں گی'' اُس نے امی کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تمھارے ساتھ اور کون جا رہا ہے اور یہ کونسا دوست ہے جس کی بات پر تمھیں اتنا پختہ یقین ہے''۔

''آپ تو جانتی ہیں امی صرف دو ہی تو دوست ہیں میرے حسن اور آزاد...... ابھی کل ہی آزاد نے بتایا کہ اُس کے بڑے بھائی کراچی میں ہی جاب کرتے ہیں اور اُنھوں نے ہی ہمیں کراچی بلایا ہے''۔

''آزاد وہی ہے نہ جس کے ماں باپ کی کار حادثے میں وفات کے بعد اُس کے چچا نے اُس کی پرورش کی ہے اور یہ بھائی بھی میرا خیال ہے اُس کے چچا کا ہی بیٹا ہے''۔

''جی امی ہے تو چچا زاد لیکن وہ آزاد سے بہت پیار کرتے ہیں اکثر اُس کے لیے تحفے تحائف بھی بھیجتے رہتے

ہیں''۔

''ماشاءاللہ......اللہ تعالیٰ اُن کا یہ پیار قائم رکھے''۔

''اچھا امی آپ وہ لمبی کہانی سنانے والی تھیں''اُس نے یاددہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو سنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ابھی گیارہ بجنے والے ہیں ورتمھارے بابا اس وقت تک سو جاتے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہاں تمھیں کہانی سناتی رہوں اور تمھارے بابا سو جائیں تو پھر مجھے نہیں کہنا کہ میں نے بات کیوں نہیں کی''۔

''ارے امی ایسی بات ہے تو آپ پلیز جلدی جایئے''اُس نے ہڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے ابھی تم بھی اپنے کمرے میں جاؤ اور جا کر سو جاؤ باقی باتیں کل کریں گے''۔

☆......☆......☆

کھانا کھانے کے بعد ابا اپنے کمرے میں گئے تو حسن بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

''ابا جان...... مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے''اُس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو کیا بات ہے''ابا جان نے چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا۔

''جی...ابا جان......وہ میں......کراچی جانا چاہتا ہوں''۔

کیوں وہاں جا کر تم کیا کرو گے''اُن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ابا میں وہاں جا کر کوئی اچھی نوکری کرنا چاہتا ہوں''حسن نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ابا جان کو حسن کی بات سُن کر غصہ آ گیا۔

''تم نے پھر سے وہی باتیں شروع کر دی ایک سال آوارہ گردی کرنے کے بعد بھی تمھیں نوکری نہیں ملی اور اب جب میں نے تمھارے لیے بمشکل ایک نوکری تلاش کی ہے تو اب تم دوسرے شہر جا کر دھکے کھانا چاہتے ہو''۔

''ابا جان میں یہ نوکری نہیں کر سکتا میرے بھی کچھ خواب ہیں جو اس طرح کی چھوٹی جاب سے پورے نہیں ہو سکتے''۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا کے تم ساری زندگی یہی نوکری کرتے رہو جب کوئی اچھی نوکری مل جائے گی تو پھر یہ نوکری چھوڑ دینا لیکن تب تک تم میرے ساتھ چلو گے'' ابا نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''حسن نے جب دیکھا کے ابا نہیں مان رہے ہے تو وہ اُن کے قدموں میں آ کے بیٹھ گیا۔

''ابا جان آج تک آپ نے میری ہر بات مانی ہے میری ہر خواہش پوری کی بس یہ آخری خواہش بھی پوری کر دیں'' اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''حسن میں تمھارا دشمن نہیں ہوں میں جانتا ہوں کہ یہ نوکری تمھارے لائق نہیں ہے لیکن اس وقت جس طرح کہ ہمارے حالات ہیں اُس میں یہ نوکری بھی ایک غنیمت ہے'' اب اُن کے لہجے میں بھی نرمی آ گئی تھی۔

''ابا جان کل عمر اور آزاد کراچی جا رہے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ جانا چاہتا ہوں وہاں جا کر آخری کوشش کرنا چاہتا ہوں میں وعدہ کرتا ہوں کے کراچی سے واپس آنے کے بعد اگر آپ مجھے چوکیدار کی نوکری کرنے کے لیے کہیں گے تو میں وہ بھی کروں گا کم از کم مجھے کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوگا'' اُس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے تھے۔

''ایک بار پھر سوچ لو اگر تمھیں وہاں بھی کوئی اچھی نوکری نہیں ملی تو پھر تم واپس آ کر چُپ چاپ میرے ساتھ دفتر چلو گے''۔

''جی میں وعدہ کرتا ہوں ابو جو آپ کہیں گے میں وہی کروں گا''۔

''کب جانا چاہتے ہو تم''

''جی ابا جان کل صبح جانا ہے'' حسن نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جاؤ اب جا کر تیاری کرو''۔

''بہت شکریہ ابا جان'' اُس نے ابا کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

حسن بہت خوش تھا کہ اُسے گھر والوں سے اجازت مل گئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کے دس بج چکے تھے اور وہ ابھی تک دنیا و مافیہا کی ہر شے سے بے خبر نیند کی وادیوں میں گم تھا کہ اچانک

کسی چیز کی آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔

"امی یہ آپ اتنی صبح صبح کیا کر رہی ہیں" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا تو امی سامان پیک کر رہی تھیں۔

"تمھارے لیے پیکنگ کر رہی ہوں" امی نے شرٹ بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب بابا نے اجازت دے دی" اُس نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں نے اُنھیں یہی بتایا ہے کہ تم صرف ایک مہینے کہ لیے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہے ہیں اور وہاں سے آتے ہی تم احمد بھائی کی کمپنی جوائن کر لو گے"۔

"ایسا میں نے کب کہا تھا"۔

"اگر ہم تمھاری خوشی کیلیئے تمھیں کراچی جانے کی اجازت دے سکتے ہیں تو تم بھی ہماری خوشی کیلیئے اتنا تو کر ہی سکتے ہو"۔

"اور اگر مجھے کراچی میں نوکری مل گئی تو پھر......" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

"تب کی تب دیکھی جائے گی ابھی اُٹھو ناشتہ کرو اور اپنی دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ کل رات سے اُن کی طبیعت کافی خراب ہے"۔

"اچھا تو پھر پہلے دادی کو ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں ناشتہ واپس آ کر کر لوں گا"۔

عمر بات سُنو ......کیا جنت کو پتا ہے کہ تم کراچی جا رہے ہو" وہ جانے لگا تو اُنھیں نے آواز دی۔

"نہیں امی کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی"۔

"کیوں......؟" اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

"پچھلی دفعہ جب اُس سے ملا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ جب تک نوکری نہیں ملتی میرے سامنے نہیں آنا"۔

"غصے میں کہہ دیا ہوگا"۔

"ٹھیک ہے جب غصہ اُترے گا تو خود ہی کال کر لے گی" اُس نے بھی بے دلی سے جواب دیا۔

"تو کیا تم اُسے نہیں بتاؤ گے"۔

”امی آپ فکر نہ کریں میں نے روحا کو کہہ دیا ہے وہ جنت کو بتا دے گی میں ابھی دادی ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں“۔

☆......☆......☆

”جنت میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں میں نے بھی تمھارے ساتھ ایک خوشگوار مستقبل کے خواب دیکھے ہیں لیکن میرے حالات ابھی ایسے نہیں کے میں اپنے اور تمھارے خواب پورے کرسکوں اور ہمارے سارے خوابوں کی بنیاد میری نوکری پر ہے۔میں نے اس شہر میں نوکری تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن یہاں مجھے جاب نہیں ملی۔

جنت میں تمھارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں تمھارے بابا کی کمپنی میں نوکری بھی لیکن میں وہ سب کرنے سے پہلے ایک آخری کوشش کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ کراچی جا رہا ہوں۔کراچی ایک بہت بڑا شہر ہے اور مجھے اُمید ہے کے کہیں نہ کہیں تو مجھے کوئی نوکری مل ہی جائے گی اور اگر مجھے کراچی میں بھی کوئی نوکری نہ ملی تو واپس آکر چپ چاپ انکل کی کمپنی جوائن کرلوں گا، جانے سے پہلے ایک بار تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کے اب تمھارے سامنے اُسی وقت آؤں گا جب مجھے کوئی اچھی نوکری مل جائیگی۔یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے دور جا رہا ہوں بلکہ میری منزل تو صرف تم ہو اور میں اُس راستے کی تلاش میں جا رہا ہوں جو تم تک پہنچتا ہے۔

میرا انتظار کرنا اور اپنا اور سب گھر والوں کا خیال رکھنا“۔

تمھارا عمر

عمر کے جانے کے بعد اُس کی بہن نے جنت کو خط دے دیا تھا خط پڑھ کر جنت اپنی حرکت پر نادم ہوگئی تھی اُسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

”روبینہ کچھ دنوں کی بات ہے وہ کونسا ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے آرہے ہیں“ راشد نے روبینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہاں تو یہ ہمارا گھر ہے کوئی گیسٹ ہاؤس تو نہیں یہاں بہت سارے ہوٹل ہیں وہ کہیں بھی رہ سکتے ہیں“۔

”روبینہ وہ میرا بھائی ہے اگر میرا گھر ہوتے ہوئے بھی وہ کسی ہوٹل میں رہے گا تو خاندان میں میری کیا عزت رہ جائے گی“۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ تمھارا مسئلہ ہے“ اُس نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

راشد کو یہ سُن کر بہت دکھ ہوا کہ اُس کی بیوی کو اُس کی عزت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ پھر راشد نے روبینہ کو قائل کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

”آزاد کیا سوچے گا وہ تو یہی سوچے گا نہ کے بھائی نے بھابی کے کہنے پر اُسے اپنے گھر نہیں رکھا اور واپس جا کر وہ سب کو بتائے گا کے بھابی نے مجھے اپنے گھر نہیں آنے دیا جس سے سب لوگ تمھارے خلاف ہو جائیں گے“۔

جب بات اپنی عزت پر آئی تو روبینہ نے اُنھیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

”ٹھیک ہے وہ یہاں رہ سکتے ہیں لیکن مجھ سے یہ اُمید مت رکھنا کے میں ملازموں کی طرح اُن کی خدمت کروں گی کیا تم نے مجھ سے شادی اسی لیے کی تھی کے میں تمھارے خاندان والوں کی ملازموں کی طرح خدمت کروں“ روبینہ نے رونے کے سے انداز میں کہا۔

”سچ کہتے ہیں لو میرج کر کے بندہ کتنا بے بس ہو جاتا ہے“ راشد منہ میں بڑبڑایا۔

”کیا کہا تم نے“ روبینہ نے راشد کو گھور کے دیکھا۔

”کچھ نہیں بہت شکریہ جو تم نے اجازت دے دی“ اُس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب میں اُنھیں لینے سٹیشن جا رہا ہوں وہ وہاں میرا انتظار کر رہے ہوں گے“۔

☆......☆......☆

”جنت کیا بات ہے بیٹا تم کچھ پریشان لگ رہی ہو“ احمد صاحب شام کو آفس سے واپس آئے تو وہ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

”جی پاپا تھوڑی طبیعت خراب ہے“ اُس نے ستائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں“۔

’’نہیں پاپا بس سر میں درد ہے میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں کچھ دیر آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی‘‘۔

’’ہاں جاؤ تم آرام کرو‘‘۔

کچھ دیر بعد مسز احمد چائے لے کر آ گئی۔

’’کل بھابی کا فون آیا تھا وہ اسد کے لیے جنت کا رشتہ مانگ رہی تھیں‘‘ اُنھوں نے چائے کا کپ احمد صاحب کی طرف بڑھایا۔

’’تو کیا تم نے اُنھیں بتایا نہیں کے جنت کی منگنی عمر سے ہو چکی ہے‘‘۔

’’جی بتایا تھا لیکن وہ کہہ رہی تھیں کے ایک بار احمد سے بات کر لو پھر کوئی فیصلہ کرنا‘‘۔

’’مجھ سے بات کیا کرنی ہے زینب تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ عمر اور جنت کی شادی بابا کا آخری فیصلہ تھا اور ہم نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے‘‘ اُنھوں نے اپنا وعدہ پھر سے یاد کروایا۔

’’ہوں مجھے یاد ہے......ویسے کیا آپ کو خبر ہے کے آپ کا پیارا بھتیجا یہ شہر چھوڑ کر جا چکا ہے‘‘۔

’’زینب یہ تم کیا کہہ رہی ہو عمر کہاں گیا ہے‘‘ احمد صاحب کو یہ سُن کر حیرت ہوئی۔

’’جنت بتا رہی تھی کے اُس نے ایک خط بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کے وہ کام کی تلاش میں کراچی جا رہا ہے‘‘۔

’’بے وقوف ہے یہ لڑکا میں نے تو کہا تھا کے اگر تمھیں نوکری نہیں مل رہی تو میری کمپنی جوائن کر لو آخر ہمارا جو کچھ بھی ہے وہ سب ان دونوں ہی کا تو ہے پھر کراچی جانے کی کیا ضرورت تھی‘‘ اُن کے لہجے میں شکایت اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

☆......☆......☆

’’لو بھئی پہنچ گئے...... یہ رہا میرا چھوٹا سا گھر‘‘ راشد نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔

’’ماشاءاللہ...... بھائی آپ کا گھر بہت ہی اچھا ہے‘‘ حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’تم لوگ اندر چلو میں گاڑی سائیڈ پر لگا کر آتا ہوں‘‘ وہ اپنی آلٹو کار کو پارکنگ پر لگانے چلا گیا۔

وہ دونوں دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور آزاد نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

''السلام وعلیکم بھابھی کیسی ہیں آپ'' آزاد نے روبینہ کو دیکھتے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......میں بالکل ٹھیک ہوں تم کیسے ہو آزاد''۔

''میں ٹھیک ہوں بھابھی...... یہ میرے دوست ہیں عمر اور حسن'' اُس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''خوش آمدید'' اُس نے اُن دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی شکریہ بھابھی''۔

''اور بتاؤ گھر میں سب کیسے ہیں''۔

''سب ٹھیک ہیں اور آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں''۔

''یاد تو ہم بھی کرتے ہیں لیکن کیا کریں نوکری سے فرصت ہی نہیں ملتی'' اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''عجیب بات ہے نہ بھابھی سات سال ہو گئے آپ کی شادی کو لیکن آج پہلی بار آپ کو حقیقت میں دیکھ رہا ہوں'' آزاد نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں شادی کے بعد ایک ہفتے کیلئے ہم لاہور گئے تھے لیکن اُس وقت تم ہوسٹل میں تھے اس لیے تم سے ملاقات نہیں ہو سکی''۔

''ارے بھئی ساری باتیں دروازے پر ہی کرو گے کیا یا اندر بھی چلو گے'' راشد نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''سوری......اندر آؤ تم لوگ بیٹھو میں تمھارے لیے کھانا لگاتی ہوں''۔

''نہیں بھابھی آپ پریشان مت ہوں راشد بھائی نے راستے میں ہمیں کھانا کھلا دیا ہے'' عمر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''بھابھی بچے کہاں ہیں'' آزاد بچوں سے ملنا چاہتا تھا۔

''بچے تو سو گئے ہیں اور ایسا کرو کہ تم لوگ بھی یہ سامنے والے کمرے میں جا کر سو جاؤ باقی باتیں صبح ناشتے پر

ہوں گی'' راشد نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا جو اُنھیں کھانا باہر سے ہی کھلا دیا ورنہ بیچارے بھوکے ہی سوتے'' اُن کے کمرے میں جاتے ہی روبینہ نے راشد کے کان میں سرگوشی کی۔

''اتنا تو میں تمھیں جانتا ہی ہوں'' اُس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''طعنے دینا بند کرو اور چلو ہم بھی جا کر سو جاتے ہیں صبح آفس بھی جانا ہے''۔

☆......☆......☆

جنت اپنے ہی خیالوں میں گم تھی لیکن اُس کی انگلیاں مسلسل حرکت کر رہی تھی جو ریموٹ سے ٹی وی کے چینل بدلنے میں مصروف تھی۔

''جنت بی بی اگر آپ نے ٹی وی نہیں دیکھنا تو مجھے تو دیکھنے دے کب سے آپ چینل تبدیل کر رہی ہیں کہیں ایک جگہ ٹھہرنے تو دیں'' بانو اُن کی پرانی ملازمہ کی بیٹی تھی اور جنت کی ہم عمر بھی اس لیے جنت اُسے نوکرانی نہیں بلکہ اپنی سہیلی سمجھتی تھی اور وہ بھی بے تکلفی سے اُس سے بات کر لیتی تھی۔

''کیا کروں بانو کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا'' وہ بدستور چینل بدلنے میں مصروف تھی۔

''جب سے عمر صاحب کراچی گئے ہیں آپ کو تو کچھ اچھا ہی نہیں لگتا''۔

''نام مت لو اُس کا میرے سامنے میری طرف سے وہ کراچی جائے یا بھاڑ میں جائے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا'' اچانک اُس کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا تھا۔

''فرق پڑا تو ہے اور کتنا پڑے گا جب سے عمر صاحب گئے ہیں نہ آپ کو کھانا اچھا لگتا ہے نہ ہی گھومنا پھرنا اور تو اور دو دن ہو گئے ہیں آپ نے وہ پی جا (Pizza) بھی نہیں منگوایا پہلے تو ہر روز منگواتی تھی پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ مجھے فرق نہیں پڑتا''۔

''وہ تو مجھے ڈاکٹر نے باہر کا کھانا کھانے کے لیے منع کیا ہوا ہے'' اُس نے بہانا بناتے ہوئے کہا۔

''پچھلے دو دن سے آپ گھر سے باہر نہیں نکلی اور ڈاکٹر گھر میں آیا نہیں تو پھر ڈاکٹر نے کیسے منع کر دیا'' بانو بھی حاضر دماغ تھی۔

''بکواس بند کر بانو میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں تجھے پیزا ہی کھانا ہے نا وہ میرا موبائل پکڑاؤ میں ابھی منگوا لیتی ہوں'' اُس نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''بات پی جا کی نہیں ہے آپ مان کیوں نہیں لیتی کہ عمر صاحب کے جانے کی وجہ سے ہی آپ پریشان ہیں''۔

''اُس نے تو جانے سے پہلے مجھے ایک بار ملنا بھی گوارہ نہیں کیا'' جنت نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو ہو سکتا ہے کہ اُن کے دماغ میں وہ بات ہو جو آپ نے کہی تھی''۔

''وہ تو میں نے غصے میں کہہ دیا تھا'' اُسے اپنی بات پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

''لیکن عمر صاحب نے تو سچ سمجھ لیا ہوگا''۔

''چلو ٹھیک ہے مان لیا کہ ملنے کہ لیے میں نے ہی منع کیا تھا لیکن دو دن ہو گئے اُسے کراچی گئے ہوئے اور اُس نے مجھے ایک فون بھی نہیں کیا''۔

''آپ نے بھی تو کوئی فون نہیں کیا''۔

''کیا بات ہے تُو عمر کی بڑی طرف داری کر رہی ہے''۔

''کیوں آپ کو جلن ہو رہی ہے......؟''۔

''ن..نہی..نہیں مجھے کیوں جلن ہو گی اور تو یہاں مہمانوں کی طرح کیا بیٹھی ہوئی ہے چلو جاؤ یہاں سے اور جا کہ میری لیے چائے بنا کر لاؤ'' اُس نے اپنی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

''جنت بی بی میں تو سچ کہہ رہی ہوں اور سچی بات ہمیشہ مرچی کی طرح لگتی ہے'' اُس نے جنت کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''بانو نکل جا یہاں سے ورنہ میں تیری جان لے لوں گی'' اُس نے تکیہ بانو کی طرف اُچھالا جو کمرے سے باہر بھاگ چکی تھی۔

☆......☆......☆

''آرام کرتے کرتے ہڈیاں بھی دکھنے لگی ہیں جوانوں اب میرے خیال سے کام کی تلاش شروع کرنی

چاہیے“۔
”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں نے بھائی اور بھابھی کو ہماری سی ویز دے دی ہیں وہ اپنی اپنی کمپنی میں جمع کروادیں گے“ آزاد نے اپنے بیگ سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔
”آزاد یہ راشد بھائی نے لومیرج کی ہوئی ہے نا“ حسن سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔
”ہاں تقریباً سات سال پہلے راشد بھائی کراچی آگئے تھے پھر اُنھوں نے ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی وہیں اُن کی ملاقات بھابھی سے بھی ہوئی پھر اُن دونوں نے کراچی میں ہی شادی کرلی“ اُس نے مختصراسارا واقعہ پیش کردیا۔
”لگتا ہے تمھارے چچا چچی کا رویہ راشد بھائی کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں ہے ورنہ کیسے کوئی اولاد ماں باپ کی شرکت کے بغیر اپنی خوشیاں مناسکتی ہے“۔
”اصل میں بھائی یہی چاہتے تھے کہ شادی لاہور میں ہو لیکن بھابھی لاہور نہیں جانا چاہتی تھیں پھر راشد بھائی نے ہم سب کو بلایا تھا لیکن چچا کی طبیعت خراب تھی جس وجہ سے ہم شرکت نہیں کر سکے“۔
”تو کیا تمھارے چچا چچی بھابھی سے آج تک نہیں ملے“ حسن کو تشویش ہوئی۔
”شادی کے بعد راشد بھائی کچھ دنوں کے لیے بھابھی کو لے کر گئے تھے لیکن میں اُس وقت ہوسٹل میں تھا“
”اچھا یار یہ راشد بھائی اور اُن کی بیوی دونوں ہی کام کرتے ہیں تو اُن کے بچوں کی کیئر کون کرتا ہے“ عمر نے بھی سوال داغا۔
”یہ بات میں نے بھی راشد بھائی سے پوچھی تھی تو اُنھوں نے بتایا تھا کہ ایک ماسی رکھی ہوئی ہے جو گھر کے کام کاج بھی کرتی ہے اور سکول سے واپس آنے کے بعد اُن کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے“۔
”لیکن پچھلے دو دنوں سے ہم نے تو کوئی ماسی نہیں دیکھی“۔
”اب وہ ماسی چھٹی پر تھی اسی لیے تو راشد بھائی باہر سے کھانا منگواتے تھے کیونکہ بھابھی کو تو کھانا بنانا آتا نہیں اس لیے ابھی اُٹھو ماسی نے ناشتہ تیار کردیا ہے پھر چلتے ہیں کہیں روزگار کی تلاش میں“ اُس نے بیگ سے شرٹ نکال کر حسن کی طرف پھینکی۔

''اخبار دیکھی تم نے آج کی'' عمر نے سامنے والے ٹیبل سے اخبار اُٹھائی اور اُس کے صفحے پلٹنے لگا۔

''ہاں اخبار میں تو کافی اشتہار آئے ہوئے ہیں باری باری چلتے ہیں''۔

☆......☆......☆

''السلام وعلیکم......'' اُس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......کیسی ہے میری بچی'' دادی نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں دادی جان آپ کی طبیعت کیسی ہے''؟۔

''بیٹا اس عمر میں طبیعت کا کیا پتہ چلتا ہے کبھی ٹھیک ہو جاتی ہے تو کبھی خراب......میری چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ تم کیوں اتنی بجھی بجھی سی ہو''۔

''کچھ نہیں دادی جان بس تھوڑی سی طبیعت خراب ہے'' اُس نے بجھے سے انداز میں جواب دیا۔

''اچھا دادی بڑی امی کہاں ہیں مجھے اُن سے کچھ بات کرنی ہے''۔

ارے بیٹا عائشہ کچن میں ہے دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی ہے''۔

''ٹھیک ہے دادی جان آپ آرام کریں میں بڑی امی سے مل کر آتی ہوں''۔

''ہاں ٹھیک ہے جاؤ اور اپنا خیال رکھا کرو''۔اُس نے اپنا بیگ وہیں دادی کے پاس چھوڑا اور کچن کی طرف چل دی۔

''السلام وعلیکم......کیسی ہیں میری بڑی امی'' وہ کچن میں داخل ہوئی تو بڑی امی برتن دھونے میں مصروف تھیں۔

''بڑی امی تو ٹھیک ہیں لیکن تم کہاں غائب ہو اتنے دن سے جب سے عمر کراچی گیا ہے تب سے تم بھی نظر نہیں آئی''۔

''میرا اُس کے کہیں جانے سے کیا تعلق ہے میری تو طبیعت خراب تھی اس لیے نہیں آئی''۔

''اچھا اب کیسی طبیعت ہے تمھاری''۔

''پہلے سے بہتر ہے''۔

''ویسے بڑی امی ایک طرف آپ ہیں جب دیکھیں کچن میں گھسی رہتی ہیں اور دوسری طرف ماما ہیں اُنھیں تو دھوئیں سے بھی سخت الرجی ہے''۔

''بیٹا زینب کی بات اور ہے وہ ایک امیر گھر کی بیٹی ہے شروع سے ہی اُس کے گھر میں نوکروں کا تانتا بندھا ہوا تھا اس لیے اُسے کبھی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی لیکن ہماری اتنی اوقات نہیں کہ نوکر رکھ سکیں اس لیے سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں اور روحا تو ابھی چھوٹی ہے اور بہو ابھی تک آئی نہیں جو میرا ہاتھ بٹائے'' اُنھوں نے پوری روداد سنا دی تھی۔

''اور اگر آپ کی بہو کو بھی کوئی کام نہ آتا ہوا تو'' اُس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا۔

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسی میری بہو کو بہت اچھی طرح جانتی ہو'' اُنھوں نے بھی اُسی انداز میں پوچھا۔

''جی جانتی ہوں عمر نے جانے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا اور اسی لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں تا کہ یہ جان سکوں کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ آپ لوگوں نے ہماری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ہمارے بچپن میں ہی کر دیا تھا'' اُس نے بالآخر پوچھ لیا تھا۔

''بیٹا یہ ایک بہت ہی لمبی کہانی ہے'' اُنھوں نے حسب عادت ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی۔

''بڑی امی میں آدھی کہانی سُن چکی ہوں باقی آپ آرام سے سنائیں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے''۔

''اور یقیناً یہ آدھی کہانی بھی عمر نے ہی سنائی ہو گی تمھیں'' اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

''جی......'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''توبہ ہے اس لڑکے کے پیٹ میں بھی کوئی بات نہیں رہتی'' بڑی امی نے عمر کو کوستے ہوئے کہا۔ ''اچھا تم یہ تو جانتی ہو کہ تمھارے ماما پاپا نے گھر والوں سے چھپ کر شادی کی تھی اُس کے بعد گھر والوں کو پتا چل گیا اور احمد بھائی کی شامت آ گئی اُس کے بعد سب نے اُن سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔ پورا سال وہ معافی مانگتے رہے باقی لوگوں نے تو پھر بھی اُن کو معاف کر دیا تھا لیکن بابا اُن کی شکل بھی نہیں دیکھتے تھے''۔

''پھر کیا ہوا'' وہ بھی پوری دلچسپی سے سُن رہی تھی۔

''پھر ایک دن احمد بھائی تمھیں اپنی گود میں اُٹھا لائے اُس وقت مشکل سے تم دو ماہ کی ہو گی حسب معمول بابا احمد بھائی کو دیکھ کر بابا اپنے کمرے میں جانے لگے تو وہ بابا کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور تمھیں بابا کی گود میں تھما دیا۔

تمھارے معصوم سے چہرے کو دیکھ کر بابا اپنا سارا غصہ بھول گئے اور تمھیں پیار کرنے لگے۔

''تو کیا دادا جان نے بابا کو معاف کر دیا''۔

پہلے پہلے تو یہی چلتا رہا احمد بھائی کے آتے ہی بابا تمھارے ساتھ کھیلنے لگ جاتے اور اُن سے بات بھی نہیں کرتے تھے لیکن جب تم سے اُلفت بڑھتی گئی تو اُنھوں نے احمد بھائی کو اس شرط پہ معاف کر دیا کہ زینب اور احمد بھائی کو یہاں ہمارے ساتھ آ کر رہنا ہو گا''۔

''لیکن میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے آپ کو اُسی گھر میں دیکھا ہے''۔

''احمد بھائی زینب کو لے کر آ گئے تھے لیکن زینب بڑے گھر میں رہنے کی عادی تھی اُس کا گزارہ اس چھوٹے سے گھر میں کیسے ہو سکتا تھا اس لیے اُس نے بمشکل ایک ہفتہ گزارا اور یہاں سے چلی گئی''۔

''تو کیا دادا جان نے اُنھیں روکا نہیں''۔

''نہیں...... کیونکہ بابا جانتے تھے کہ زینب یہاں نہیں رہنے والی اور وہ اپنے بیٹے کا گھر بھی خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے اُنھوں نے احمد بھائی کو بھی جانے کی اجازت دے دی'' بڑی امی نے قصہ مختصراً کرتے ہوئے کہا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے بڑی امی لیکن اصل بات تو آپ نے ابھی تک نہیں بتائی آخر دادا جان نے کیوں بچپن میں ہی ہماری منگنی کر دی تھی'' اُسے اپنے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا تھا۔

''کیونکہ بابا جان تمھیں خود سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے امی اکثر اُنھیں کہا کرتی تھیں کہ بیٹی پرایا دھن ہے ایک نہ دن تو ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی اس لیے بابا نے ایک دن سب کو اکٹھا کیا اور تمھاری اور عمر کی منگنی کر دی اور ہم سب نے بھی یہ فیصلہ خوشی خوشی قبول کر لیا لیکن افسوس کہ بابا بہت جلد ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے اُنھوں نے تو یہ سوچا تھا کہ اس طرح تم ہمیشہ اُن کے پاس رہو گی لیکن شاید اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا'' بڑی امی کی

آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"کتنا پیار کرتے تھے دادا جان مجھ سے لیکن مجھے تو یاد بھی نہیں کہ وہ کیسے دکھتے تھے" جنت بھی افسردہ ہوگئی تھی۔

"خیر چھوڑو یہ سب باتیں یہ بتاؤ کہ کیا تمھیں کوئی فون کیا ہے عمر نے" بڑی امی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... جب سے کراچی گیا ہے ایک بار بھی مجھے فون نہیں کیا لگتا ہے ناراض ہے مجھ سے" اُس نے منہ بسور کر کہا۔

"دو ہفتے ہو گئے ہیں اُسے گئے ہوئے لیکن مجھ سے بھی صرف دو تین بار ہی بات ہوئی ہے لیکن تم پریشان نہ ہو اب تو کچھ ہی دن رہ گئے ہیں اُس کے واپس آنے میں آ لینے دو پھر میں اچھی طرح اُس کے کان کھینچوں گی" بڑی امی نے اُس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

"اور سنائیں زین صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے" وہ خاموش قدم کمرے میں داخل ہوا اور زین (راشد کا بیٹا) کے پاس آ کر بیٹھ گیا جو اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔

"چاچو یہ مزاج کیا ہوتا ہے......؟" اُس نے معصومیت بھرے انداز سے پوچھا۔

"بیٹا مزاج سے میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کا کیا حال چال ہے"۔

"ٹھیک ہوں......"۔

"یہ تم نیچے کہنیوں کے بل لیٹ کر ہوم ورک کیوں کر رہے ہو......؟" وہ بھی اُس کی طرح کہنیوں کے بل لیٹ گیا۔

"کیونکہ مجھ سے کرسی پر بیٹھ کر ہوم ورک نہیں لکھا جاتا اس لیے نیچے لیٹ کر لکھ رہا ہوں"۔

"تو بیٹا آپ بستر پر لیٹ جاتے"۔

"بستر پر حسن چاچو سوئے ہوئے تھے اس لیے میں یہی بیٹھ گیا......" اُس نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

"سوری بیٹا جب سے ہم لوگ آئے ہیں تب سے ہم آپ لوگوں کے روم میں رہ رہے ہیں اس لیے آپ کو

بہت تکلیف ہو رہی ہے"۔

"نہیں عمر چاچو ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ ہمیں تو بہت مزہ آتا ہے آپ ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں اور ہمیں کہانیاں بھی سناتے ہیں"۔

"اچھا یہ حسن آج اتنی جلدی کیسے سو گیا وہ تو دس گیارہ بجے سے پہلے سوتا ہی نہیں"۔

"آج سکول سے چھٹی تھی تو ہم حسن چاچو کے ساتھ باہر گئے ہوئے تھے تو ہم نے اُن کو بہت گھمایا آج اس لیے وہ تھک گئے تھے"۔

"اچھا جی اس کا مطلب کے جناب آج سارا دن تفریح کرتے رہے ہیں اور ہمیں بتایا بھی نہیں"۔

"آپ تو آزاد چاچو کے ساتھ چلے گئے تھے"۔

"ہاں ہمیں ایک ضروری کام تھا......اچھا یہ مریم کہاں ہے وہ کہیں نظر نہیں آ رہی"۔

"حسن چاچو اُسے کہانی سنا رہے تھے تو وہ بھی اُن کے ساتھ ہی سو گئی"۔

"چلو ٹھیک ہے نو بجنے والے ہیں میں حسن کو بستر سے اُٹھا دیتا ہوں تم بھی سو جاؤ"۔

"نہیں نہیں رہنے دیں آج میں آپ کے ساتھ نیچے سو جاتا ہوں ویسے بھی مجھے ابھی آپ سے وہ جن والی کہانی بھی سُننی ہے"۔

"اچھا تو ٹھیک ہے پھر آ جاؤ سناتا ہوں تمھیں کہانی" زین اپنی کتابیں سمیٹنے میں مصروف ہو گیا اور عمر اپنا بچھونا سیدھا کرنے لگا۔

☆......☆......☆

"ایک مہینہ ہو چکا ہے اُنھیں یہاں آئے ہوئے اور کب تک وہ ہمارے گھر بیٹھے رہیں گے" روبینہ نے راشد سے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں جیسے ہی کوئی نوکری ملے گی وہ لوگ یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے" راشد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"اگر ملنی ہوتی تو اب تک مل گئی ہوتی مجھے تو لگتا ہے کہ وہ لوگ تو یہاں سیر و تفریح کرنے آئے ہیں" روبینہ

نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے وہ لوگ کوشش کر رہے ہیں انشا اللہ جلد ہی کوئی اچھی نوکری مل جائے گی''۔

''میں بچوں کو سنبھالوں گھر کو دیکھوں یا تمھارے بھائی اور اُس کے دوستوں کی آؤ بھگت کروں تم اُن سے کہو کے یہاں سے چلے جائیں اب اور اُنھیں برداشت نہیں کرسکتی'' جب اُس نے دیکھا کہ راشد ٹس سے مس نہیں ہو رہا تو اُس نے جذباتی انداز اپنایا۔

''صبر کرو یار کچھ دنوں کی بات ہے تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے والے ہیں بس نوکری ملنے کی دیر ہے پھر وہ چلے جائیں گے'' راشد اُسے سمجھا رہا تھا اس بات سے بے خبر کے کھڑکی سے آزاد اُن کی ساری باتیں سُن رہا ہے۔۔

''لیکن'' ......روبینہ کی نظر آزاد پر پڑی تو وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

جب راشد نے آزاد کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

''اُن کی باتیں سُن کر آزاد کو راشد کی بے بسی کا اندازہ ہو چکا تھا۔

''لاکھ دفعہ تمھیں سمجھایا ہے کے بکواس کرنے سے پہلے کچھ سوچ بھی لیا کرو اب آزاد کیا سوچے گا''۔

''وہی سوچے گا جو سوچنا چاہیے اور اچھا ہی ہوا جو اُس نے سب کچھ سُن لیا ورنہ تم تو اُسے کچھ کہنے والے نہیں تھے'' وہ اُٹھی اور پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلی گئی اور راشد وہیں سر پکڑ کہ بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

''یار مجھے تو لگتا ہے کے ہماری قسمت ہی خراب ہے ہم لاہور کو کوس رہے تھے لیکن اب تو ایک ماہ ہو گیا ہے کراچی آئے ہوئے لیکن یہاں بھی کوئی نوکری نہیں ملی'' حسن نے غمگین لہجے میں کہا۔

''ہاں یار تمام کمپنیوں میں انٹرویو دے چکے ہیں لیکن ابھی تک کہیں سے جواب نہیں آیا'' عمر نے بھی حسن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''آج بھابی بھی راشد بھائی سے بات کر رہی تھی کے وہ ہم سے کہہ دیں کہ ہم یہاں سے چلے جائیں'' آزاد نے بھی اپنی آپ بیتی سنا دی۔

''میرے خیال سے بھابی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اب ہمیں واپس چلے جانا چاہیے'' عمر بھابھی کے فیصلے سے متفق تھا۔

''لیکن واپس لاہور جا کر کیا کریں گے''۔

''یار میں نے ابو سے وعدہ کیا تھا کے اگر ایک مہینے تک کوئی اچھی نوکری نہ ملی تو واپس آ کر جہاں وہ کہے گے وہاں نوکری کروں گا'' حسن کو ابو سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔

''میں نے بھی سوچ لیا ہے یار میں بھی واپس جا کر احمد انکل کے ساتھ آفس جوائن کرلوں گا کیوں کے میں جنت کو کھونا نہیں چاہتا چاہے اُس کے لیے مجھے اپنی عزت نفس ہی کیوں نہ کھونی پڑے''۔

''تم دونوں نے تو اپنی اپنی منزل سیٹ کر لی ہے میرا کیا ہوگا'' آزاد کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

''فکر مت کر یار جب نہ چاہتے ہوئے میں احمد انکل کی کمپنی جوائن کر سکتا ہوں تو تجھے وہاں سیٹ کرنا کونسا مسئلہ ہے''۔

''اچھا اگر تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو پھر چلتے ہیں میں آج راشد بھائی سے کہتا ہوں کے ہمارے لیئے ٹکٹوں......کا انتظام کروا......''۔

''کیا ہوا......؟'' حسن نے آزاد سے پوچھا جو بات کرتے کرتے رُک گیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کوئی چپکے سے ہماری باتیں سُن رہا ہے'' اچانک آزاد کی نظر اُس شخص پر پڑ گئی تھی جو درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ہم پہ نظر رکھنے کی کس کو ضرورت آن پڑی'' حسن کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

''اچھا یار تم لوگ باتیں کرو میں کچھ کھانے کہ لیے لے کر آتا ہوں'' آزاد نے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اُس شخص کا دھیان بھٹانے کہ لیے باتوں میں مصروف ہو گئے اور آزاد نے چپکے سے جا کر پیچھے سے اُس شخص کو پکڑ لیا۔

''کون ہو تم اور ہماری جاسوسی کیوں کر رہے تھے'' آزاد نے اُسے ایسے زور سے دبوچا کہ وہ گھبرا گیا۔

اتنے میں عمر اور حسن بھی وہاں آ گئے۔

''یہ کون ہے'' عمر نے آزاد سے پوچھا۔

''پتا نہیں پر یہ ہماری باتیں سُن رہا تھا'' آزاد نے جواب دیا۔

''کون ہو تم اور ہماری باتیں کیوں سُن رہے تھے؟'' حسن جو پہلے ہی غصے میں تھا اُس شخص کو پکڑا اور ایک زوردار مُکا رسید کیا ......۔

''م ......میرا نام جا...... جابر ہے میں یہاں سے گزر رہا تھا آپ کی باتیں سُنی تو سوچا کے شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں'' جابر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو'' عمر کو اُس کی بات سُن کر حیرت ہوئی تھی۔

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کہیں بیٹھ کر بات کریں'' جابر نے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

اُنھوں نے جابر کو چھوڑ دیا اور وہیں درخت کے پاس بیٹھ گئے۔

''اب بتاؤ تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو'' حسن نے پوچھا۔

''میں نے ابھی آپ کی باتیں سنیں آپ لوگ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہو رہے تھے اور آپ کو نوکری نہیں ملے گی کیونکہ اس ملک میں رشوت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا سب سیاستدان مل کر اس ملک کو تباہ کر رہے ہیں اس ملک کے سربراہ بڑے بڑے دعوے تو ضرور کرتے ہیں لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہیں کرتے یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے پیسے لے کر پاکستان کو نقصان پہنچا رہے ہیں'' جابر نے تقریر کرنے کے سے انداز میں کہا۔

''تو اس بات کا ہم سے کیا تعلق ہے'' آزاد نے لاپرواہی کا اظہار کیا۔

''اس دُنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو حرام کام کر کے اپنا پیٹ بھرتے ہیں لیکن صرف چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایمانداری سے کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو صلہ نہیں ملتا''۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو صاف صاف بتاؤ'' اُس کی باتیں عمر کے سر کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔

''دیکھو تم لوگ یہاں کب سے ذلیل ہو رہے ہو تو تم بھی یہ جان ہی چکے ہو کے اس ملک میں ایمانداری کی کوئی قیمت نہیں ہر طرف کرپشن اور رشوت عام ہے اگر تم کسی کمپنی میں رشوت دے کر نوکری حاصل کر بھی لیتے ہو

تو تمھاری ساری زندگی کی کمائی حرام ہوگی کیونکہ تم وہ نوکری غلط طریقے سے حاصل کرو گے لیکن اگر تم ہمارے لیے کام کرو تو تم اچھے کام کر کے نہ صرف بہت ساری نیکیاں کما سکتے ہو بلکہ اچھے خاصے پیسے بھی کما سکتے ہو یہ سمجھ لو کے جنت تمھارا مقدر ہوگی اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی''۔

''کیا بکواس ہے یہ ہمیں تمھارے لیے کوئی کام نہیں کرنا چل نکل یہاں سے'' عمر نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''عمر رُک نہ یار بات تو کرنے دے'' آزاد نے عمر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تمھارے لیے کیا کام کرنا ہوگا'' حسن کو تجسّس ہوا۔

''پریشان مت ہو میں تم سے کوئی غلط کام کرنے کو نہیں کہہ رہا میں ایک مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں''۔

''تمھیں دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ تمھارا تعلق کسی مذہبی جماعت سے ہو میرا مطلب ہے کہ نہ ہی تم نے داڑھی رکھی ہے اور نہ ہی تمھارے سر پر امامہ ہے پھر ہم کیسے مان لیں کہ تم مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہو'' عمر کو تشویش ہوئی۔

''تم لوگوں نے بھی تو داڑھی نہیں رکھی تو کیا تم مسلمان نہیں ہو'' وہ بھی حاضر دماغ تھا۔

''لیکن ہمارا تعلق کسی مذہبی جماعت سے بھی نہیں ہے''۔

''جس طرح ہر مسلمان داڑھی والا نہیں ہوتا اسی طرح ہر مذہبی جماعت والا بھی داڑھی اور امامے والا نہیں ہوتا'' اُس نے اپنی دلیلوں سے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے اپنے کام کے بارے میں بتاؤ'' عمر مزید بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔

''تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ آجکل بہت سے نوجوان نوکری نہ ملنے کی وجہ سے خودکُشی کر لیتے ہیں یہ بھی نہیں سوچتے کہ اُن کے بعد اُن کے گھر والوں کا کیا ہوگا میں اُن نوجوانوں کی تلاش کرتا ہوں پھر اُنھیں قائل کر کہ حلال طریقے سے روزی اور نیکیاں کمانے کا طریقہ سکھاتا ہوں'' اُس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' حسن نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''وہ میں ابھی تمھیں نہیں بتا سکتا فی الحال تم میری بات پر غور ضرور کرنا اور یہ یاد رکھنا اگر تم ہمارے لیے کام

کرو گے تو دنیا اور آخرت میں جنت تمھارا مقدر ہوگی اور اگر بات سمجھ میں آئے تو اس نمبر پر فون کر لینا پھر میں تمھیں اپنے مولانا سے ملواؤں گا وہی تمھارے سارے سوالوں کے بہتر جواب دے سکتے ہیں"۔

جابر نے اُنھیں کارڈ تھمایا اور چلتا بنا اور وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے......

☆......☆......☆

"تو تم لوگوں نے جانے کی تیاری کر لی ہے" راشد نے اُن کو سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"جی بھائی لاہور میں نوکری نہ ملنے کی وجہ سے یہاں آئے تھے ہم نے سوچا تھا کے شاید وہاں حالات خراب ہیں لیکن یہاں آ کر ہمیں پتہ چلا کے پورے پاکستان میں یہی صورت حال ہے" آزاد نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جب میں نے گریجوایشن کی تھی تو ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے نوکری مل گئی تھی لیکن اب تو ایسا لگتا ہے جیسے اس ملک میں نوکریوں کی قلت پڑ گئی ہے"۔

"ظاہری سی بات ہے قلت تو ہونی ہی ہے ہر سال گریجویٹ طالب علموں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے لیکن نوکریاں صرف چند سو کی تعداد میں موجود ہوتی ہیں اور پھر اُن میں بھی سفارش اور رشوت' میرٹ کا تو کہیں نام ونشان بھی نظر نہیں آتا" عمر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ویسے تم لوگ ابھی جوان ہو میری مانو تو باہر کہیں دوسرے ملک میں چلے جاؤ وہاں تمھیں آسانی سے نوکری مل جائے گی ترقی یافتہ ممالک میں پڑھے لکھے افراد کی بڑی قدر ہے کیونکہ وہاں رشوت اور سفارش کا عمل دخل نہیں ہوتا" راشد بھائی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"راشد بھائی فی الحال ابھی تو ہم واپس لاہور جا رہے ہیں وہاں جا کر گھر والوں سے مشورے کے بعد ہی کچھ سوچیں گے کے آگے کیا کرنے ہیں"۔

"فکر مت کرو انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا ابھی تم لوگ آرام کرو میں تمھارے لیے ٹکٹوں کا انتظام کر کہ آتا ہوں"۔

"شکریہ راشد بھائی آپ نے ہمارے لیے بہت تکلیف اُٹھائی ہے" عمر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”ارے تم لوگ تو میرے بھائی ہو اور بھائیوں کی موجودگی سے خوشی ہوتی ہے تکلیف نہیں“ ابھی آرام کرو میں چلتا ہوں۔

”اچھا یار تم دونوں بیٹھو میں گھر فون کر کے آتا ہوں کافی دن ہو گئے ہیں کسی سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی“ عمر اُن دونوں سے رخصت لے کر چھت پر آ گیا اور اپنی جیب سے موبائل نکال کر تیزی سے نمبر ملانے لگا۔

☆......☆......☆

فائنل امتحان ہونے سے پہلے والے چند دن پڑھائی کے لیئے بڑے اہم ہوتے ہیں اور اس بات کو وہ بخوبی جانتی تھی اسی لیے وہ بھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں پڑھائی میں مصروف تھی اُس کی نظریں کتاب پر جمی ہوئی تھی اور ہونٹ بڑی تیزی سے ہل رہے تھے جب پڑھتے پڑھتے آنکھیں بوجھل ہونے لگی تو اُس نے اُٹھ کر کمرے میں ٹہل کر پڑھنا شروع کر دیا لیکن وہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی کچھ یاد نہیں کر پا رہی تھی اور کرتی بھی کیسے اُس کی نظریں تو کتاب پر تھی لیکن دماغ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے پڑھ رہی تھی لیکن ابھی تک وہ صرف دو چار جملے ہی یاد کر سکی تھی بالآخر تنگ آ کر اُس نے کتاب بند کر کے تکیے پر رکھی اور خود بھی وہیں لیٹ گئی اُس کی نظریں اُوپر چھت کی طرف تھیں اور دایاں بازو اُس کی آنکھوں کے گرد تھا وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی نیند کی وادی میں کھونے ہی والی تھی کے موبائل کی گھنٹی کی آواز سے چونک گئی اُس نے موبائل اُٹھا کر دیکھا تو سکرین پر چمکنے والے نمبر کو دیکھ کر اُس کی ساری سُستی جاتی رہی۔

”ہیلو......“ جنت نے جلدی سے ریسیو کا بٹن دبایا اور موبائل اپنے کان سے لگایا۔

”کیسی ہو جنت“ فون کے دوسری طرف سے آواز آئی۔

”معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں“ جنت نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

”تم مجھے نہ پہچانو یہ ہو ہی نہیں سکتا“۔

”فون رکھو مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی“ اُس نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں اگر تمھیں مجھ سے بات نہ کرنی ہوتی تو تم فون ہی نہیں اُٹھاتی“ اُس نے شوخی بھرے انداز میں کہا۔

''وہ تو میں پڑھائی میں مصروف تھی اس لیے نمبر دیکھے بغیر ہی فون اُٹھا لیا'' اُس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو'' عمر کو جنت کی ناراضگی کا احساس ہو گیا تھا۔

''ہاں تو کیا نہیں ہونا چاہیے ایک مہینہ ہو گیا ہے تمھیں کراچی گئے ہوئے لیکن جب سے تم گئے ہو ایک بار بھی تم نے فون نہیں کیا'' اُس کے لہجے میں شکایت اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''تمھاری ناراضگی درست ہے لیکن کیا کروں وقت ہی نہیں ملا''۔

''اچھا جی ایسی بھی کیا مصروفیت تھی جناب کی جو فون کرنے کا بھی وقت نہیں تھا'' اُس کے لہجے میں غصہ بدستور قائم تھا۔

''کچھ خاص نہیں بس صبح سے شام تک نوکری کی تلاش میں ہی اتنا تھک جاتا تھا کے کچھ کرنے کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا لیکن تم کیوں اتنا ناراض ہو رہی ہو تم نے بھی تو خبر لینے کی کوشش نہیں کی کے میں کس خال میں ہوں زندہ بھی ہوں یا......''۔

''اللہ نہ کرے کے تمھیں کچھ ہو' عمر ایسی فضول باتیں نہ کیا کرو مجھے ڈر لگتا ہے'' اچانک جنت کے لہجے میں غصے کی جگہ پیار اُمڈ آیا تھا۔

عمر کا تیر بالکل نشانے پر لگا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کے جنت کو کیسے منانا ہے اس لیے اُس نے جان بوجھ کر ایسی بات کہی تھی۔

''دادی ہمیشہ کہتی ہیں کوئی لمحہ قبولیت کا بھی ہوتا ہے اور اُس وقت منہ سے نکلی بات سچ بھی ہو جاتی ہے اس لیے ہر وقت منہ سے اچھی باتیں ہی نکالنی چاہیے' اور رہی بات خبر لینے کی تو میں نے فون اس لیے نہیں کیا کیوں کے مجھے تو تم پر غصہ تھا تم مجھے بتائے بغیر جو چلے گئے تھے''۔

''ہاں تو تم نے ہی تو کہا تھا کے اب تمھارے سامنے تب ہی آؤں جب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں اور تب میں نے بھی یہ ارادہ کر لیا تھا کے اب تم سے اُسی وقت ملوں گا جب مجھے نوکری مل جائے گی اسی لیے تو میں تم سے ملے بغیر کراچی آ گیا''۔

''وہ تو غصے میں میرے منہ سے نکل گیا تھا'' بالآخر دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تھی۔

''سوچا تو یہ تھا کے اتنے بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی اچھی نوکری مل ہی جائے گی پھر ایک دو سال یہاں کام کروں گا ایک اچھا سا گھر بناؤں گا وغیرہ وغیرہ لیکن افسوس اکثر ہم جو سوچتے ہیں وہ نہیں ہوتا'' اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے سوچنے نہ سوچنے سے کیا فرق پڑتا ہے ہونا تو وہی ہے جو نصیب میں لکھ دیا گیا ہے''۔

''ویسے جنت کتنا اچھا ہوتا نا اگر ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا جو ہم چاہتے ہیں تو یہ زندگی کتنی خوبصورت ہوتی' کاش ہماری زندگی بھی کسی جادوئی ڈرامے کی طرح ہوتی تو پھر ہمیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر ذلیل وخوار نہ ہونا پڑتا نہ ہی کوئی پریشانی ہوتی اور نہ ہی کوئی ضرورت بس خواہش کرنے کی دیر ہوتی اور اگلے ہی لمحے وہ چیز ہماری خدمت میں خاضر ہوتی تو پھر ہماری کوئی بھی تمنا لاحاصل نہ ہوتی'' وہ اپنی تصوراتی زندگی کا نظارہ پیش کرنے لگا۔

'' اگر ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا جو ہم چاہتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو کون یاد کرتا' کون اُس خالق حقیقی سے مصیبت اور ضرورت کے وقت گڑگڑا کر اپنے لیے دعائیں مانگتا' اور جس زندگی کی تم خواہش کر رہے ہو ایسی زندگی تو صرف جنت میں ہی مل سکتی ہے''۔

''لیکن اگر انسان کوشش کرے تو اس زندگی کو بھی جنت بنا سکتا ہے''۔

''کوشش کرنا اچھی بات ہے بلکہ زندگی تو نام ہی جدوجہد کا ہے لیکن ہم انسان کبھی بھی اپنی زندگی کو جنت نہیں بنا سکتے کیوں کے ہماری خواہشات کی کوئی حد نہیں ایک خواہش پوری ہوتی نہیں کے دوسری خواہش سر اُٹھا لیتی ہے'' وہ بھی آج لیکچر دینے کے موڈ میں تھی۔

''اچھا چھوڑو یہ باتیں گھر میں سب کیسے ہیں میں کب سے گھر فون کرنے کی کوشش کر رہاں ہوں لیکن کوئی ریسیو ہی نہیں کر رہا'' وہ جانتا تھا کہ وہ باتوں میں نہیں جیت سکتا اس لیے اُس نے بات بدل دی۔

''رات کافی ہوگئی تو شاید سب اپنے کمروں میں ہوں اس لیے کوئی فون نہیں اُٹھا رہا ہوگا یہاں سب ٹھیک ہے اگر کوئی کام ہے تو مجھے بتا دو' میں تمھارا پیغام دے دوں گی۔

''نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے میں نے تو بس یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا کے میں کل واپس آرہا ہوں''۔

''کیا واقعی تم واپس آرہے ہو'' اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں جس کام کے لیے آیا تھا جب وہی نہیں ہوا تو پھر یہاں رُک کر کیا کرنا ہے''۔

''اچھا کتنے بجے کی ٹرین سے آرہے ہو ٹائم بتا دو میں تمھیں لینے سٹیشن آجاؤں گی'' جنت اُس سے ملنے کی لیے بے چین تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے تمھیں آنے کی میں خود ہی گھر آجاؤں گا اور ویسے بھی میں کونسا کوئی معرکہ سرانجام دے کر آرہا ہوں جو تم میرا استقبال کرنے کے لیئے آؤ گی'' اُس کی باتوں سے نا اُمیدی بارش کی بوندوں کی طرح ٹپک رہی تھی۔

''عمر مایوسی گُناہ ہے صبر کرو انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''پوچھو گی نہیں کہ واپس آکر کام کیا کروں گا''۔

''تم بس واپس آجاؤ...... پھر جو دل چاہے وہی کرنا قسم سے اگر تم بابا کی کمپنی جوائن کرنے کی بجائے چائے سموسے کی ریڑھی بھی لگاؤ گے تو میں پھر بھی تمھارے ساتھ ہوں بلکہ میں خود چائے سموسہ بنانے میں تمھاری مدد کروں گی'' اُس نے بھی حوصلہ افزائی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

''ہا...... ہاہا...... تمھیں چائے سموسہ بنانا آتا ہے......؟'' عمر نے اُس کی بات کو مذاق سمجھ کر زور سے قہقہ لگایا۔

''نہیں آتا پھر بڑی امی سے سیکھ لوں گی'' وہ بالکل بھی مذاق کے موڈ میں نہیں تھی۔

''جنت جب تم میرے لیے اتنا کر سکتی ہو تو کیا میں تمھاری خوشی کے لیے تمھارے بابا کی کمپنی جوائن نہیں کر سکتا''۔

''کیا تم نے واقعی......'' اُسے یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ واپس آتے ہی انکل کے ساتھ آفس جانا شروع کر دوں گا''۔

''بابا یہ بات سُنے گے تو بہت خوش ہونگے لیکن کیا تم خوش ہو''۔

”مجھے ہر اُس کام سے خوشی ملتی ہے جس سے تمھارے چہرے پر رونق آ جائے کیونکہ جب میں تمھیں مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت سکون ملتا ہے“ اُس کی اس بات پر وہ شرما گئی تھی اس لیے اُس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”ٹھیک ہے پھر رات کافی ہو گئی ہے اور صبح جلدی اُٹھنا ہے اب فون رکھتا ہوں“ اُس نے خاموشی کے تالے کو توڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں“ ابھی تک تو اُس کے کانوں کی پیاس ہی نہیں بجھی تھی جو اُس کی آواز سننے کے لیے ترس گئے تھے۔

”باتیں تو مجھے بھی تم سے کرنی ہے لیکن واپس آ رہا ہوں نا پھر جی بھر کر بات کریں گے اور گھر میں سب کو بتا دینا کہ میں کل شام تک گھر پہنچ جاؤں گا“۔

”ٹھیک ہے پھر میں تمھارا انتظار کروں گی“۔

”اللہ حافظ“ اُس نے الوداعی کلمات ادا کر کے فون بند کر دیا۔

وہ عمر کے واپس آنے کی خبر سُن کر بہت خوش تھی۔ وہ کوئی پردیس سے سالوں بعد تو نہیں لوٹ رہا تھا لیکن اُس کے بغیر جنت کے لیئے یہ ایک مہینہ بھی صدیوں کے برابر تھا اُس کا دل چاہ رہا تھا کے اُڑ کر جائے اور سب کو بتا دے کے عمر واپس آ رہا ہے لیکن وہ یہ سوچ کر رہ گئی کے رات کافی ہو گئی ہے اور یقیناً سب اس وقت سو چکے ہونگے اور وہ بھی سونا چاہتی تھی تا کے جلدی سے رات گزر جائے اسی لیئے وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی لیکن نیند تو جیسے اُس کی آنکھوں سے اُڑ گئی تھی بالآخر کروٹیں بدلنے کے بعد اُسے نیند نے اپنی آغوش میں لے ہی لیا۔

☆......☆......☆

”اگر تم ہمارے لیئے کام کرو تو دُنیا اور آخرت میں جنت تمھارا مقدر ہو گی“ جابر کا یہ جملہ ابھی تک حسن کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

”آخر کون تھا وہ اور ہمارے پاس ہی کیوں آیا، اور ایسا کونسا کام کرنے کہ لیے کہہ رہا تھا جس میں پیسوں

کے ساتھ نیکیاں بھی کمائی جاسکتی ہیں''؟ یہ چند سوال تھے جن کے وہ جواب تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اُس نے عمر اور آزاد کی طرف دیکھا جو اس وقت نیند کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے لیکن حسن کی آنکھوں سے نیند اوجھل تھی وہ ابھی بھی جابر کے بارے میں سوچ رہا تھا پہلے تو اُسے خیال آیا کے عمر اور آزاد کو اُٹھائے اور اُن سے بات کرے لیکن حسن اُن دونوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیئے وہ اُنھیں سوتا چھوڑ کر کمرے سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

''پھر تم دونوں نے کیا سوچا ہے'' ابھی اُن دونوں کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھی کہ حسن نے تذکرہ شروع کردیا۔

''کس بارے میں'' عمر نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''یار میں جابر کی بات کررہا ہوں جو ہمیں کل ملا تھا'' حسن نے اُنھیں یاد دلایا۔

''حسن جب ہم واپس جانے کا فیصلہ کرچکے ہیں تو پھر ہمیں جابر کے بارے میں سوچ کر کیا کرنا ہے''۔

''یار لوگ پیسوں کے لیئے برے سے بُرا کام کرنے سے بھی نہیں گھبراتے لیکن اگر وہ جابر سچ کہہ رہا ہے تو ہم اس دنیا میں پہلے خوش نصیب ہوں گے جن کو اچھے کام کے بدلے میں بھی بہت سارا پیسہ ملے گا اس لیئے میرے خیال سے ہمیں ایک بار اُس کی تنظیم کے سربراہ سے ملنا چاہیے تاکے پتہ تو چلے کے وہ کیا کرتے ہیں اور وہ جابر کس کام کی بات کررہا تھا'' وہ اپنے سوالوں کے جواب چاہتا تھا۔

''لیکن حسن جب ہم نے اُن کے لیئے کام کرنا ہی نہیں تو پھر ہمیں اس بات سے کیا لینا دینا کے وہ کیا کرتے ہیں کیوں کرتے ہیں'' عمر زچ ہوکر بولا۔

''میں جانتا ہوں کے تم کیوں چاہتے ہو کے ہم سب واپس چلے جائیں کیوں کے وہاں ایک خوشیوں اور دولت سے بھری زندگی تمھارا انتظار کررہی ہے لیکن ہمارا کیا ہم تیری طرح خوش قسمت نہیں ہے ہمیں وہاں جاکر ساری زندگی ایک ایسی نوکری کرنی پڑے گی جس سے گھر کا ماہانہ خرچ بھی پورا نہیں ہوتا اُس سے ہم اپنی خواہشات کیسے پوری کریں گے'' حسن نے غصے میں آکر اُسے طعنہ دے دیا۔

''تمھارے کہنے کا مطلب کیا ہے کہ میں...... یار تجھے اتنی چھوٹی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کے اگر مجھے جنت

کی دولت کا لالچ ہوتا تو میں اب تک اُس سے شادی کر کے ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوتا نہ کے تم لوگوں کے ساتھ نوکری کی تلاش میں مختلف شہروں کی خاک چھانتا' لیکن سچ تو یہ ہے حسن کے تم جلتے ہو اس بات سے کے میری شادی ایک امیر لڑکی سے ہو رہی ہے''۔

''جلتا نہیں ہوں میں تم سے بلکہ تم یہ چاہتے ہو کے ہم ساری زندگی تیری امیری پر رشک کرتے رہیں اور تیرے بڑے گھر اور لمبی لمبی گاڑیوں کو دیکھ کر جلتے رہیں''۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس...... یہ صبح صبح کیا تم دونوں نے نیا جھگڑا شروع کر دیا ہے'' آزاد نے اُن دونوں کو دیکھ کر کہا جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔

''حسن کیوں فضول میں بحث کر رہے ہو آخر تم جابر کے لیڈر سے کیوں ملنا چاہتے ہو''۔

''یار وہ جب سے ہمیں ملا ہے میرے دماغ میں کچھ سوال اُٹھ رہیں ہیں میں صرف اُن سوالوں کا جواب چاہتا ہوں''۔

''عمر تم یہی چاہتے ہو نا کے ہم لاہور واپس چلے جائیں تو آج ہم جا رہے ہیں لیکن جانے سے پہلے اگر حسن اُس شخص سے مل کر اپنے سوالوں کے جواب چاہتا ہے تو ایک بار اُس سے مل لیتے ہیں'' آزاد نے مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم بھی یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں'' عمر کے رضامند ہونے کی دیر تھی کہ حسن نے اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور اُس پر لکھا ہوا نمبر ملایا۔

''السلام وعلیکم......جی کون'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''میں حسن بات کر رہا ہوں کل تم سے ملاقات ہوئی تھی اور تم نے ہمیں اپنا کارڈ دیا تھا'' حسن نے اُسے اپنا تعارف کروایا۔

''ہاں مجھے یاد ہے تو پھر آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے'' جابر نے سب سے پہلا سوال یہی کیا۔

''ہم کچھ بھی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کے لیڈر سے ملنا چاہتے ہیں''۔

''تو پھر ٹھیک ہے ایک گھنٹے بعد اُسی جگہ پر آ جانا جہاں کل ہم ملے تھے میں تمھیں اپنی جماعت کے سربراہ

سے ملوانے لے چلوں گا"۔

"ٹھیک ہے ہم ایک گھنٹے تک وہاں پہنچ جائیں گے" اُس نے فون بند کیا اور جیب میں ڈال لیا۔

☆......☆......☆

حسن تو اُس سے ملنے کے لیئے اتنا بے چین تھا کے مقررہ وقت سے پہلے ہی عمر اور آزاد کو اپنے ساتھ لے کر اُس جگہ پہنچ گیا تھوڑی دیر بعد جابر بھی وہاں آ گیا۔

"کیا تم واقعی ہمارے سربراہ سے ملنا چاہتے ہو" جابر نے اُن سب کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہم اُن سے ملنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ کریں گے" حسن نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے گاڑی میں بیٹھ جاؤ" جابر نے کار کا دروازہ کھولا۔

وہ تینوں کار میں بیٹھ گئے تو جابر نے کار سٹارٹ کی اور مین روڈ کی طرف لے گیا کچھ دیر بعد ایک سنسان سڑک پر پہنچ کر اُس نے کار روک دی۔

"کیا ہوا تم نے گاڑی یہاں کیوں روک دی" عمر نے پوچھا۔

"تم لوگ اپنی اپنی آنکھوں پر یہ پٹی باندھ لو" جابر نے اُنھیں کالے رنگ کا کپڑا دیتے ہوئے کہا۔

"آنکھوں پر پٹی کیوں" آزاد سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

"کیوں کے جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں اور جب تک ہمیں تم پر پورا یقین نہیں ہو جاتا تم کو وہ جگہ نہیں دکھائی جا سکتی پریشان مت ہو یہ سب ہماری سیکیورٹی کے لیے ہے" جابر نے جواب دیا۔

اُن تینوں نے اپنی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور گاڑی چل پڑی۔ تقریباً ایک گھنٹہ جابر گاڑی کو ایک ہی سڑک پر گھماتا رہا تاکے ایسا لگے جیسے وہ کافی دور آ چکے ہیں پھر اُس نے گاڑی کا رُخ ایک کچی سڑک کی طرف کر دیا آنکھوں پر پٹی ہونے کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کار کسی لکڑی کے پل پر چل رہی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد جابر اُنھیں ایک ایسے علاقے میں لے آیا جہاں آبادی بہت کم تھی۔

"اب تم لوگ اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا سکتے ہو" اُس نے کار ایک جگہ روکتے ہوئے کہا۔

تینوں نے اپنی پٹیاں اُتاری اور کار سے باہر نکل آئے۔اس وقت وہ ایک انجان علاقے میں تھے جہاں آبادی برائے نام تھی اور جو لوگ وہاں رہائش پذیر تھے سب کے سب کچے مکانوں میں رہتے تھے البتہ مسجد کے دائیں طرف والا مکان دوسروں کی نسبت کافی بڑا تھا اور اس کے اندر پتھر بھی لگا ہوا تھا یقیناً وہ جماعت کے سربراہ کا مکان تھا۔

''تم لوگ یہیں ٹھہرو میں مولانا سے اجازت لے کر آتا ہوں'' جابر اُن سب کو وہیں چھوڑ کر گھر کے اندر چلا گیا۔کچھ دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اُس کے ساتھ ایک ضعیف العمر شخص تھے جنھوں نے سفید رنگ کی شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی چاند سا روشن چہرہ اور سمندر سی گہری آنکھیں عمر کے اس حصے میں بھی وہ کافی پرکشش نظر آتے تھے اُن کے چہرے پر لمبی سفید داڑھی جو کے سینے تک بڑھی ہوئی تھی اور اُنھوں نے ہاتھ میں تسبیح پکڑی ہوئی تھی۔

''السلامُ علیکم'' مولانا نے اُن کو دیکھتے ہی سلام کیا۔

''وا علیکم السلام'' سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''یہ مولانا جبار ہیں ہماری تنظیم کے بانی اور سربراہ......اور مولانا یہ ہیں وہ نوجوان جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا'' جابر نے اُن تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی تم لوگوں نے بہت بڑا اور افضل فیصلہ کیا ہے.اگر تمھاری طرح اور نوجوان بھی اپنے آپ کو اسلام کے لیئے وقف کردیں تو وہ دن دور نہیں جب اسلام کے دشمن صفہ ہستی سے مٹ جائیں گے''۔

''میں معافی چاہتا ہوں لیکن ابھی ہم لوگوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہم تو صرف آپ سے ملنے کے لیئے تشریف لائے ہیں'' عمر نے مولانا کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کے ابھی آپ لوگوں کے دماغ میں میری جماعت کے بارے میں بہت سارے سوال اُٹھ رہیں ہوں گے اس جماعت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کے آپ کے تمام سوالوں کا تسلی بخش جواب دوں''۔

''آپ لوگ کون ہیں اور آپ نے یہ تنظیم کس مقصد کے لیئے بنائی ہے'' حسن نے پہلا سوال کیا۔

''ہم لوگ مجاہد ہیں ہم اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے غلام ہیں جو خود بھی اُن کے احکامات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس طرف راغب کرتے ہیں میری تنظیم کا مقصد تبلیغ اسلام اور اسلام کی بقا کے لیئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے''۔

''جابر نے بتایا کہ اگر ہم لوگ آپ کے لیے کام کریں تو ہم پیسوں کے ساتھ ساتھ بہت ساری نیکیاں بھی کما سکتے ہیں ایسا کونسا کام ہے اور کس طرح ہم یہ سب حاصل کر سکتے ہیں'' عمر نے بھی اپنا سوال داغ دیا۔

''جہاد کے زریعے'' مولانا نے بغیر رُکے جواب دیا۔

''جہاد......؟''۔

''ہاں جہاد......اللہ کی راہ میں جہاد'' مولانا نے اپنی بات کو پھر سے دہرایا۔

''جہاد تو ہمیشہ دشمنانِ اسلام کے خلاف کیا جاتا ہے لیکن ہم تو ایک اسلامی ملک میں رہتے ہیں پھر آپ کس کے خلاف جہاد کرتے ہیں'' مولانا کس جہاد کی بات کر رہے ہیں عمر کو ابھی تک سمجھ نہیں آیا تھا۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کے تم جیسے انگریزی کتابیں پڑھنے والے اور انگریزی ماحول میں پلنے بڑھنے والے نوجوان بھی اسلام

کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو اصل میں جس دن سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اُس دن سے ہی دشمن اس ملک کو دنیا کے نقشے سے مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں کیوں کے ہمارا ملک اسلام کا قلعہ ہے پہلے وہ اپنے ملکوں سے سازش کرتے تھے لیکن اب کچھ غداروں کی وجہ سے ہمارے ملک میں بھی شامل ہو گئے ہیں'' مولانا نے مزید وضاحت کی۔

''میں نے تو سُنا تھا کے جہاد فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے لیکن جابر نے بتایا کے آپ جہاد کے بدلے میں پیسے بھی دیتے ہیں کیا آپ بتائیں گے کے ایسا کونسا جہاد ہے'' آزاد نے بھی اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

''دراصل ہمارے وہ بھائی جو میدان میں جا کر جہاد نہیں کر سکتے وہ جہاد بالمال کے دریعے ہماری مدد کرتے ہیں اور بہت سے ایسے نوجوان ہیں جو صرف اس وجہ سے جہاد کا حصہ نہیں بنتے کیوں کے اُن کے کندھوں پر اُن کے خاندان والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے اسی لیئے ہم اُن کو کچھ پیسے دیتے رہتے ہیں جس سے اُن کے گھر والوں

کی ضروریات زندگی پوری ہوسکیں'' مولانا بھی پوری حاضر دماغی سے اُن کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

''اگر آپ لوگ جہاد ہی کرتے ہیں تو پھر یہ سب آپ چھپ کر کیوں کرتے ہیں میرا مطلب ہے کہ یہ کام تو آپ حکومت کے ساتھ مل کر بھی کر سکتے ہیں'' عمر نے پوچھا۔

''کس حکومت کی بات کر رہے ہو تم کیا تم نہیں جانتے کے یہ سیاستدان کافروں سے چند جملے تعریف اور ڈھیر ساری مالی امداد حاصل کرنے کے لیئے اپنے ہی مسلمان مجاہدوں کا خون بہاتے ہیں یہ لوگ نہ تو خود کچھ کرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں کچھ کرنے دیتے ہیں اس لیئے ہمیں مجبوراً یہ سب چھپ کر کرنا پڑتا ہے'' اس سوال کے جواب دیتے ہوئے مولانا کی آواز میں بلندی آ گئی تھی۔

''اچھا اب نماز کا وقت ہو گیا ہے انشااللہ آپ سے پھر ملاقات ہو گی......خدا حافظ'' مولانا نے مزید سوالوں کے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور واپس گھر کے اندر چلے گئے اور جابر بھی اُن کے پیچھے ہو لیا۔

''یہ لڑکے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چالاک ہیں مجھے نہیں لگتا یہ ہمارے کام آسکیں گے''۔

''آپ پریشان نہ ہوں یہ وہی کریں گے جو ہم ان سے کروانا چاہتے ہیں بس تھوڑا انتظار کریں'' جابر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن کوشش کرنا جتنی جلدی ہو سکے ان کو لے آؤ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ہمیں جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنا ہو گا''۔

''جی میں پوری کوشش کروں گا......اب مجھے اجازت دیں وہ لوگ باہر میرا انتظار کر رہیں ہیں'' مولانا سے اجازت لینے کے بعد جابر نے پھر سے اُن تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُن کو اُنہی راستوں سے گھماتا ہوا واپس اُسی جگہ لے آیا جہاں سے وہ اُن کو لے کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے جب ملازمہ نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو سورج کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا جب سورج کی تیز کرنوں کی تپش اُسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو اُس نے اپنا چہرہ چادر کے پیچھے چھپا لیا۔

''بی بی جی اُٹھ جاؤ اب تو سورج بھی سر پہ آن کھڑا ہوا ہے'' ملازمہ نے چادر کھینچتے ہوئے کہا۔

''بانو! تو بھی نہ پتا نہیں صبح صبح میری نیند خراب کرنے کہاں سے آجاتی ہے اور ویسے بھی ابھی تو صرف نو ہی بجے ہیں'' اُس نے چادر واپس اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

''نو نہیں جنت بی بی اب تو بارہ بج رہے ہیں''۔

''کیا آج اتنی جلدی بارہ بج گئے'' جنت ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بی بی جی بارہ تو روز اسی وقت بجتے ہیں لگتا ہے رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی ہیں اسی لیئے آج آپ کو اُٹھنے میں دیر ہو گئی''

بانو نے اُس کے تکیے کے نیچے سے ریموٹ نکالا اور بٹن دبا کر ٹی وی بند کیا جسے جنت رات کو سوتے وقت بند کرنا بھول گئی تھی۔

''بانو ویسے روز صبح جلدی اُٹھنے کو میرا دل نہیں کرتا پھر بھی تم ہر روز صبح نو بجے مجھے جگانے آجاتی ہو اور آج جب مجھے جلدی اُٹھنا تھا تو آج تم کہاں مر گئی تھی مجھے جگایا کیوں نہیں'' جنت نے قریب پڑا ہوا تکیہ مارنے کی غرض سے بانو کی طرف اُچھال دیا۔

''میں نے سوچا تھا کے آج اتوار ہے اور آپ کو کالج سے بھی چھٹی ہے تو پھر آپ کی نیند کیوں خراب کروں ویسے جنت بی بی آپ نے آج جلدی اُٹھ کر کرنا کیا تھا'' بانو کو تجسس ہوا۔

''مجھے بڑے ابو کے گھر جانا تھا اُنھیں اطلاع دینی تھی کے آج عمر واپس آرہا ہے''۔

''اچھا تو یہ بات ہے اسی لیئے آج اتنے دنوں بعد آپ کے چہرے پر پہلے جیسی چمک نظر آرہی ہے ورنہ جب سے عمر صاحب گئے ہیں تب سے آپ اُداس بیٹھی تھی''۔

''کیا کروں جب عمر یہاں تھا تو اُس سے لڑ جھگڑ کر وقت گزر جاتا تھا لیکن جب سے وہ گیا تھا کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا''۔

''ویسے اللہ بُری نظر سے بچائے عمر صاحب ہیں ہی بہت اچھے اسی لیئے تو ہر کوئی اُنھیں پسند کرتا ہے وہ ہر کسی سے اچھے سے بات کرتے ہیں اور ہم تو نوکر ہیں پھر بھی ہم سے اتنی عزت سے پیش آتے ہیں ہمیشہ اپنی اوقات سے بڑھ کر دوسروں کی مدد کرتے ہیں خوش رہتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آس پاس والوں کو بھی خوش دیکھنا چاہتے ہیں

اور میری اماں کہتی ہے ایسے انسانوں کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے"۔

"اچھا بانو اب یہ عمر صاحب کے گُن گانا چھوڑ واور میرے کپڑے استری کر دو مجھے دیر ہو رہی ہے" اُسے اپنے سوا کسی اور کہ منہ سے عمر کا ذکر اچھا نہیں لگتا تھا۔

"لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی آپ عمر صاحب کے جانے سے اتنی اُداس کیوں تھیں آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کے وہ کچھ دنوں کے لیئے آپ سے دور چلے گئے کیوں کے جب عمر صاحب یہاں تھے تو ہر روز آپ کی اُن سے لڑائی ہوتی تھی"۔

"تھوڑی دیر بعد صلح بھی تو ہو جاتی تھی اور ویسے بھی جھگڑا بھی تو وہیں ہوتا ہے جہاں پہ......" وہ بولتے بولتے رُک گئی تھی۔

"رُک کیوں گئی میں تو کب سے جانتی ہوں کے آپ عمر صاحب کو پسند کرتی ہیں بلکہ مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ بہت جلد آپ دونوں کی شادی بھی ہونے والی ہے"۔

"یہ تجھے کس نے بتایا" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے بانو کی طرف دیکھا۔

"ویسے جنت بی بی آپ بہت خوش قسمت ہیں کے آپ کی شادی عمر صاحب سے ہو رہی ہے کاش کے میری قسمت آپ جیسی ہوتی"۔

"بانو تم ہر وقت عمر کی اتنی تعریفیں کرتی ہو کہیں تم بھی عمر سے محبت تو نہیں کرتی" اب جنت کی نگاہ شک میں بدل گئی تھی۔

"بہت اگر آپ کا دل ٹوٹنے کی فکر نہ ہوتی تو میں اب تک عمر صاحب سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی ہوتی"

اس وقت جنت حیرت سے بانو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور بانو کے چہرے پر ایسی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی کے کوئی بھی اُس کی بات پر یقین کر لیتا لیکن اگلے ہی لمحے جو اُس نے ایک زوردار قہقہ لگایا تو جنت کی جان میں جان میں آئی۔

"ہا ہا ہا...... جنت بی بی میں...... میں تو مذاق کر رہی تھی"۔ بانو نے بمشکل ہنستے ہوئے کہا۔

"بانو...... تو رُک یہیں اللہ تعالیٰ غارت کرے تجھے میری تو جان ہی نکل گئی تھی" جنت نے بانو کو مارنے کے

لیئے تکیہ اُٹھایا لیکن وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''السلام وعلیکم'' جنت نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے محسوس سے انداز میں سلام کیا (وہ جب بھی گھر میں آتی تھی اسی طرح بلند آواز میں سلام کرتی تھی)۔

''واعلیکم السلام! سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''جنت بیٹا کیسی ہو تم اتنے دن کہاں تھی میں نے تو روحا سے کہا تھا کے فون کر کے پتا کرو کہیں جنت کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی'' دادی کو اُس کے اتنے دنوں بعد آنے پر فکر لاحق ہوئی۔

''نہیں دادی طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے بس آجکل امتحان ہو رہے ہیں اس وجہ سے اتنے دن آپ سے ملنے نہیں آسکی''۔

''جنت بیٹا گھر میں سب کیسے ہیں''۔

''جی بڑے ابو گھر میں سب ٹھیک ہے اصل میں آج چھٹی تھی تو اس لیئے میں آپ سب سے ملنے چلی آئی''۔

''اچھا کیا بیٹا جو تم آ گئی ویسے بھی عمر کے جانے کے بعد یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے'' بڑی امی تو جیسے رونے کو تھیں۔

''ہاں بھئی یہ بات تو ہے جب عمر یہاں تھا تو ہر وقت روحا کو تنگ کرتا رہتا تھا اور یہ دونوں مل کر خوب شور شرابا کرتے تھے اُس وقت مجھے ان دونوں کا یوں واویلا کرنا بہت بُرا لگتا تھا لیکن اب عمر کے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے اس گھر میں کوئی رہتا ہی نہیں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی رہتی ہے'' دادی نے بھی اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''دادی اب آپ اس خاموشی میں رہنے کی عادت ڈال لیں کیونکہ عمر بھائی کہہ رہے تھے کے اگر نوکری مل گئی تو پھر وہ وہیں رہیں گے اور کبھی کبھار دو چار دن کے لیئے ہم سے ملنے آجایا کریں گے اور میرے خیال سے عمر بھائی کو کراچی میں نوکری مل گئی ہو گی اسی لیئے تو ابھی تک واپس نہیں آئے'' روحا نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے آگ لگے ایسی نوکری کو جس میں ہمیں اُس کی شکل دیکھنے کے لیئے بھی مہینوں انتظار کرنا پڑے

"دادی کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

"اماں اسی لیئے میں اُسے جانے نہیں دے رہا تھا لیکن آپ کے اصرار پر میں نے اُسے اجازت دے دی انجان شہر ہے اجنبی لوگ ہیں اور وہاں تو حالات بھی اتنے خراب ہیں پتا نہیں کس حال میں ہوگا اور صاحب زادے کی حرکت تو دیکھو ایک بار فون کر کے اپنی خیر خبر دینا بھی ضروری نہیں سمجھا" بڑے ابو کو غصہ تو تھا لیکن اکلوتے بیٹے کی فکر بھی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے بڑے ابو کل رات کو عمر نے فون کیا تھا لیکن اُس وقت آپ لوگ شاید سو گئے تھے اسی لیئے اُس نے پھر مجھے فون کیا تھا"۔

"تو آخر کار لاڈ صاحب کو ہماری یاد آ ہی گئی"۔

"اچھا کیا کہہ رہے تھے بھائی وہ کب واپس آ رہے ہیں"۔

"روحا یہی بتانے کے لیئے آئی ہوں کہ عمر آج کراچی سے واپس آ رہا ہے"۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو جنت کیا واقعی میرا بیٹا آج واپس آ رہا ہے" بڑی امی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جی بڑی امی میں سچ کہہ رہی ہوں عمر نے مجھے خود فون کر کے بتایا تھا کے وہ آج شام تک گھر پہنچ جائے گا میں نے اُس سے کہا بھی تھا کے ٹائم بتا دو میں تمھیں لینے آ جاؤں گی لیکن اُس نے کہا کے تمھیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود گھر آ جاؤں گا"۔

"بیٹا تم اُس کی بات کا بُرا مت ماننا اصل میں وہ سوچ رہا ہوگا کے نوکری نہ ملنے کی وجہ سے ہم اُس سے خفا ہوں گے یقیناً اسی لیئے اُس نے ایسا کہا ہوگا اُسے کیا پتا کے ہم اُس سے ناراض نہیں بلکہ اُس کے واپس آنے کی وجہ سے بہت خوش ہیں" بڑی امی نے اُس کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے امی ہم بھائی کا استقبال اس طریقے سے کریں گے کے وہ دیکھ کر بالکل دنگ رہ جائیں گے اور اُنھیں پتا چل جائے گا کے ہم نے اُنھیں کتنا مس کیا" روحا نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"جنت اب تک تو عمر ریل گاڑی پر سوار ہو گیا ہوگا تو کب تک گھر پہنچ جائے گا" بڑی امی کہ لیئے تو شام تک کا انتظار بھی مشکل تھا۔

''جی بڑی امی آپ کو تو پتا ہے کے ہمارے ملک میں عموماً ٹرین دو چار گھنٹے لیٹ ہی ہوتی ہے لیکن اگر ٹرین لیٹ نہ ہوئی تو عمر شام تک گھر پہنچ جائے گا''۔

''تو پھر ٹھیک ہے آج رات کے کھانے میں میں اپنے بیٹے کی پسند کی چیزیں بناؤں گی پتا نہیں اتنے دن اُس نے ٹھیک سے کھانا کھایا بھی ہوگا یا نہیں''۔

''بیگم تم فکر نہ کرو بے شک عمر کو نوکری نہیں ملی لیکن جاتے وقت اُس کے پاس اتنے پیسے تھے کے اُسے وہاں کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی اور تم تو ایسے انتظار کر رہی ہو جیسے تمھارا بیٹا ایک مہینے بعد کراچی سے نہیں بلکہ برسوں بعد لندن یا امریکہ سے لوٹ کر آرہا ہے''۔

''آپ تو جانتے ہیں کے اس سے پہلے عمر کبھی ایک دن کے لیئے بھی گھر سے باہر نہیں رہا اور یوں پہلی بار وہ اتنی دیر ہم سے دور رہا ہے اس لیئے اُس کے بغیر یہ ایک مہینہ بھی ایک سال کی طرح گزر رہا ہے''۔

''جی امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اور جب سے یہ پتا چلا ہے کے عمر بھائی آرہے ہیں وقت ہی نہیں گزر رہا ایسا لگ رہا ہے جیسے گھڑی کی سوئیاں تھم سی گئی ہیں''۔

''واقعی روحا مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے'' جنت نے بھی روحا کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اچھا تو پھر چلو اندر کمرے میں چل کے ٹی وی دیکھتے ہیں اسی طرح کچھ وقت گزر جائے گا''۔

''ہاں ٹھیک ہے'' جنت اور روحا کمرے میں چلی گئی اور بڑی امی بھی دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی سب اندر چلے گئے تو دادی نے موقع دیکھ کر بڑے ابو کو سمجھانے میں مصروف ہوگئیں''۔

''چلو بھئی اچھا ہی ہوا کے اُسے وہاں نوکری نہیں ملی اگر مل بھی جاتی تو میں اُسے اتنی دور جانے کی اجازت کبھی نہ دیتی اور تم بھی ایک بات کان کھول کر سُن لو فراز عمر کے گھر آتے ہی اُسے کھری کھری نہ سُنانے لگ جانا بلکہ ایک دو دن بعد اُسے پیار سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنا کے وہ احمد کے ساتھ کام کرنے کے لیئے راضی ہوجائے''۔

''اماں آپ فکر نہ کریں میں اُسے کچھ نہیں کہوں گا وہ تو میں نے اُس کی خوشی کی خاطر کچھ نہیں کہا تھا ورنہ میں تو خود نہیں چاہتا تھا کے وہ اتنی دور جا کر کام کرے......''۔

دادی اور بڑے ابو بات کر رہے تھے کے اندر سے روحا کے چلانے کی آواز آئی۔

روحا کے چلانے کی آواز سُن کر بڑے ابو اندر کی جانب بھاگے بڑی امی بھی کچن سے بھاگتی ہوئی آئیں جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو روحا اور جنت سامنے کھڑی تھیں اُن کی پیٹھ بڑی امی کی طرف تھی اور نظریں ٹی وی جمی ہوئی تھی۔

''تمھاری چیخ سُن کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی روحا مجھے لگا کے تمھیں کرنٹ لگ گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کے تم دونوں ٹھیک ہو'' بڑی امی نے اُن دونوں کی طرف دیکھا تو اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا تم چلا کیوں رہی تھی'' بڑے ابو نے روحا اور جنت سے پوچھا لیکن اُن دونوں پر تو جیسے کوئی سکتہ طاری ہوا اور خوف کے مارے وہ کچھ نہیں بول پا رہیں تھی۔

''کیا ہوا روحا تم کچھ بولتی کیوں نہیں'' بڑی امی نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر زور سے ہلایا تو روحا کچھ ہوش میں آئی وہ منہ سے کچھ نہ بولی اُس نے صرف اپنے دائیں ہاتھ سے سامنے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے ابو نے ٹی وی کی طرف دیکھا جس پر اُس وقت کوئی نجی نیوز چینل چل رہا تھا اور اُس پر اس وقت کسی حادثے کی جگہ کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ فراز صاحب نے ٹیبل سے ریموٹ اُٹھایا اور ٹی وی کی آواز میں اضافہ کیا۔

''اس وقت جو مناظر آپ اپنے ٹی وی کی سکرین پر دیکھ رہے ہیں یہ اب سے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے دردناک واقعے کے ہیں ہم آپ کو بتاتے چلیں کے یہ افسوسناک واقعہ اب سے کچھ دیر قبل کراچی کے ریلوے سٹیشن پر پیش آیا'' ایک خاتون رپورٹر بڑی تیزی سے خبریں پیش کر رہی تھی اور اُس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ سب گھر والوں کی سانسیں تیز ہو رہی تھی۔

''ابتدائی اطلاعات کے مطابق ریلوے سٹیشن پر بم نصب کیا گیا تھا جو کے ریموٹ کنٹرول تھا اور جو نہی ٹرین کی روانگی کا وقت ہوا عین اُسی وقت ایک زوردار دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں پچاس سے زائد افراد ہلاک اور ایک سو سے زیادہ زخمی ہوئے، دھماکا اتنی شدید نوعیت کا تھا کے آپ اپنے ٹی وی کی سکریں پر دیکھ سکتے ہیں کے جگہ جگہ خون اور انسانی اعضاء بکھرے پڑے ہیں۔ پولیس اور امدادی ٹیموں نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر کاروائی

شروع کردی ہے امدادی ٹیمیں اس وقت زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے میں مصروف ہیں'' اتنا خون اور خوفناک مناظر دیکھ کر تو بڑی امی بے خوش ہوگئی تھی اور بڑے ابو کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''جنت بیٹا عمر کو فون کرو پتا تو کرو کے وہ کیسا ہے''۔

''جی بڑے ابو'' جنت نے اپنے موبائل سے کئی بار عمر کا نمبر ملایا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

''بڑے ابو عمر کے نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا'' یہ خبر سُن کر تو جیسے کوئی پہاڑ گر گیا ہو لیکن ابھی بھی اُن کو اُمید تھی اور اُن کی نظریں دکھائے جانے والے مناظر میں صرف عمر کو ہی تلاش کر رہی تھی۔

اچانک جنت کی نظر ایک گھڑی پر پڑی جس کی حالت بگڑ چکی تھی۔

''بڑے ابو وہ دیکھیے یہ تو وہی گھڑی ہے جو میں نے عمر کو اُس کی سالگرہ پر تحفے میں دی تھی'' عمر کی گھڑی دیکھ کر بڑے ابو کو جو آخری اُمید تھی وہ بھی ٹوٹ چکی تھی اُن کے سانس محال اور دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی اُنھوں نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا اور نم آنکھوں سے ٹی وی کی طرف دیکھتے رہے اور بالآخر وہیں چکر کھا کر گر گئے۔

☆......☆......☆

وہ سب مقررہ وقت پر سٹیشن پہنچ گئے تھے لیکن معمول کے مطابق ٹرین لیٹ تھی۔ راشد بھائی بھی اُن تینوں کو اپنی گاڑی میں سٹیشن چھوڑنے آئے تھے بچوں نے ساتھ جانے کی ضد کی تو وہ روبینہ اور دونوں بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ وہ ریل گاڑی آنے کا انتظار کر رہے تھے کے اچانک عمر کے فون کی گھنٹی بجی۔

''میں صبح سے تم لوگوں کے فون کا انتظار کر رہا تھا لیکن تم نے فون ہی نہیں کیا'' جابر نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں لیکن ہم لوگ تمھارا ساتھ نہیں دے سکتے ہم واپس اپنے گھر جا رہے ہیں'' عمر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''واپس جا کر کیا کرو گے''......؟۔

''یہ تو سوچا نہیں کہ واپس جا کہ کیا کرنا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو کے ہم تمھاری مان کر جان بوجھ کر موت کی وادی میں کود جائیں''۔

''موت ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ایک نہ ایک دن سب کو مرنا ہے لیکن شہید کبھی مرتا نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیئے زندہ ہو جاتا ہے اور بیروزگاری سے مرنے سے بہتر ہے کہ جہاد کرو اگر کامیاب لوٹ آئے تو تم غازی کہلاؤ گے اور تمھارے پاس اتنے پیسے بھی ہونگے کے تم اپنی زندگی آسانی سے گزار سکو گے اور اگر شہید ہو گئے تو تم کو جنت میں بہت بڑا مقام ملے گا اور تمھارے گھر والوں کو اتنے پیسے ملے گے جتنے تم ساری زندگی بھی نہیں کما سکو گے'' اُس نے ایک بار پھر سے اُن کو لالچ دینے کی کوشش کی۔

''دیکھو ہمیں نہ تو تمھاری کسی بات کی سمجھ آ رہی ہے اور اور نہ ہی تمھارے کسی کام کی اس لیئے تم سے میری درخواست ہے کہ دوبارہ فون کرنے کی کوشش مت کرنا''

جب اُسے پیار سے سمجھ نہیں آئی تو عمر نے غصے کا سہارا لیا۔

''کیا واقعی تم لوگ واپس جا رہے ہو'' اُس نے پھر سے کنفرم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں ہم اس وقت ریلوے سٹیشن پر کھڑے ہیں ابھی کچھ دیر میں ہم ہمیشہ کے لیئے لاہور چلے جائیں گے''

''کیا تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے''؟۔

''ہاں ہم نے بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے اس لیئے اب دوبارہ فون مت کرنا'' عمر نے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فون بند کر دیا۔

پورے دو گھنٹے بعد ریل گاڑی چلنے کی آواز آئی تو سب مسافر اپنا اپنا سامان اُٹھا کر ریل گاڑی کی طرف بھاگے اُن تینوں نے بھی اپنا سامان اُٹھایا اور ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ آزاد نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بچے ابھی بھی الوداعی کلمات ادا کرنے کے لیئے اپنے ہاتھ ہلا رہے تھے پھر اچانک ایک شور سا برپا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس جگہ کا سارہ نقشہ ہی تبدیل ہو گیا' فضا میں ہر طرف چیخ و پکار کی آوازیں گونج رہی تھیں سٹیشن کے فرش پر خون اور انسانی عضاء بکھرے ہوئے تھے کچھ دیر پہلے جو لوگ اپنے پیاروں کو خوشی خوشی رخصت کرنے آئے تھے اب وہ آنکھوں میں آنسو لیئے اُن کے ٹکڑے تلاش میں لگے ہوئے تھے اور جہاں بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھ ہلا کر اُنھیں الوداع کہہ رہے تھے اب اُس جگہ اُن معصوم بچوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی ہوئیں تھیں۔

پہلی بار موت کو اتنی بار قریب سے دیکھا تھا کس طرح دبے پاؤں خاموشی سے موت آئی اور پلک جھپکتے ہی

اتنے سارے لوگوں کو اپنے

ساتھ لے گئی' نا جانے کہاں سے چند میڈیا والے اُس جگہ پر پہنچ گئے تھے لیکن پولیس والے ابھی تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔ ایسا دردناک نظارہ دیکھ کر سب اپنے خوش وحواس کھو بیٹھے تھے آزاد کو تو سکتہ سا ہو گیا تھا وہ آنکھ جھپکے بغیر زین اور مریم کی طرف دیکھے جا رہا تھا جو اس وقت خون میں لت پت آڑھے ترچھے پڑے ہوئے تھے اور حسن اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا عمر کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے لیکن اُس نے آگے بڑھ کر ریسکیو ٹیموں کا ساتھ دیا اور اُن کے ساتھ مل کر زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا اس دوران اُس کی گھڑی بھی کہیں گر گئی تھی لیکن جہاں اس قدر انسانی عضا بکھرے ہوں وہاں گھڑی کی کسے ہوش رہتی ہے ۔

☆......☆......☆

''سر چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن آپ ابھی تک قاتل کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے'' راشد اور اُس کے بیوی بچوں کی تدفین کے بعد آزاد عمر کو لے کر تھانے آ گیا تھا۔

''ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں ابتدائی تحقیقات کے مطابق سٹیشن پر ایک ریموٹ کنٹرول بم نصب کیا گیا تھا جیسے ہی لوگ ٹرین کی طرف بھاگے مجرم نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا جس کی وجہ سے دھماکہ ہوا اور اتنے معصوم لوگوں کی جانیں چلی گئیں'' ایس ایچ او نے اُن کو تفصیل بتائی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر کے دن دیہاڑے کوئی سٹیشن پر بم رکھ کر چلا جائے اور کسی کو پتا بھی نہ چلے''؟۔

''میں مانتا ہوں کے ہم سے سیکیورٹی میں کوتاہی ہوئی ہے لیکن جو قسمت میں لکھا تھا ہو گیا اب ہم اُسے بدل تو نہیں سکتے میری مانو تو تم لوگ لاہور واپس چلے جاؤ اگر مجرم پکڑا گیا تو اُسے قانون کے مطابق سزا دلوا دی جائے گی''۔

''سر جب تک میرے بھائی کے قاتل کو سزا نہیں مل جاتی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا''۔

''تم فکر مت کرو ہماری تحقیقات جاری ہیں ہم جلد حملہ آور کو پکڑ لیں گے'' ایس ایچ او نے اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''یہاں ہر روز کتنے معصوم انسانوں کو قتل کیا جا رہا ہے اب تک آپ نے کتنے قاتلوں کو پکڑا ہے' یہ روشنیوں کا

شہر کراچی ہر گزرتے دن کے ساتھ موت کے اندھیرے میں گم ہوتا جا رہا ہے اور آپ کی تحقیقات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں آخر کب آپ کی تحقیقات کسی نتیجے پر پہنچے گی اور کب ہمیں انصاف ملے گا'' اُس کی آنکھوں میں بدلے کی آگ بھڑکتی نظر آ رہی تھی۔

''میں سمجھ سکتا ہوں اس وقت تم کس تکلیف سے گزر رہے ہو لیکن اُس کا مطلب یہ نہیں کے ہم تمھاری بدتمیزی برداشت کریں گے آپ لوگ جا سکتے ہیں جب حملہ آور پکڑا جائے گا تو ہم آپ کو بلا لیں گے'' ایس ایچ او کو اُس کی باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔

''اب تک آپ اُسے پکڑ نہیں سکے تو آگے کیا پکڑیں گے سچ تو یہ ہے کے آپ کو کوئی پرواہ ہی نہیں کیوں کے مرنے والوں میں آپ کا کوئی اپنا نہیں تھا اسی لیئے ابھی تک آپ کی تحقیقات مکمل نہیں ہوئی اگر مرنے والوں میں آپ کا کوئی اپنا ہوتا تو اب تک حملہ آور پھانسی کے تختے پر لٹک رہا ہوتا'' غم اور غصے کی شدت سے وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

''بند کروا اپنی یہ بکواس اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تمھیں پکڑ کر جیل میں پھینک دوں گا اس لیئے اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے دفعہ ہو جاؤ'' ایس ایچ او نے اُسے گلے سے دبوچ لیا۔

''آزاد چلو یہاں سے......'' عمر نے ایس ایچ او سے اُس کا گریبان چھڑایا اور تھانے سے باہر لے آیا۔

''آزاد میرے خیال سے وہ انسپیکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں واپس چلے جانا چاہیے اب تک پولیس اُس حملہ آور کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی اور شاید کبھی ہو گی بھی نہیں اس لیئے میں ٹکٹوں کا انتظام کرنے جا رہا ہوں تم گھر جا کر سامان پیک کرو''۔

آزاد اپنے خاندان کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتا تھا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس میں بدلہ لینے کی آگ بڑھتی جا رہی تھی لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کے وہ ایسا کیا کرے جس سے وہ بدلہ لینے میں کامیاب ہو سکے اور اُسے پورا یقین ہو گیا تھا کے پولیس اُس حملہ آور کو کبھی نہیں ڈھونڈھ پائے گی۔

'' اس وقت صرف ایک ہی انسان ہے جو میری مدد کر سکتا ہے'' آزاد کے دماغ میں ہلچل ہوئی اس نے اپنا موبائل نکالا اور تیزی سے نمبر ملانے لگا۔

’’ہیلو......جابر؟‘‘۔

’’جی بول رہا ہوں آپ کون‘‘ اُس نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

’’میں آزاد......میں تم سے ملنا چاہتا ہوں؟‘‘۔

’’لیکن تم لوگ تو لاہور واپس چلے گئے تھے نا‘‘۔

’’جانا چاہتے تھے لیکن شائد قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا اس لیے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں‘‘۔

’’تو ٹھیک ہے پھر آدھے گھنٹے میں اُسی جگہ آ جاؤ جہاں ہم پہلے ملے تھے میں وہیں تمھارا انتظار کروں گا‘‘۔آزاد نے اپنا موبائل جیب میں ڈالا اور عمر اور حسن کو بتائے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

’’رات کے گیارہ بج رہے ہیں لیکن پتا نہیں یہ آزاد کہاں رہ گیا اب تک تو اُسے آ جانا چاہیے تھا‘‘ وہ دونوں پریشان تھے۔

’’حسن کیا تمھیں کچھ بتایا تھا اُس نے کے کہاں جا رہا ہے‘‘۔

’’نہیں یار وہ تو تمھارے ساتھ ہی باہر نکلا تھا اُس کے بعد تو گھر آیا ہی نہیں‘‘ وہ بات کر رہے تھے کے دروازے پر دستک ہوئی‘ حسن نے دروازہ کھولا تو وہ آزاد تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک پستول تھی۔

’’آزاد کہاں تھے تم اور تمھارے ہاتھ میں یہ پستول کیا کر رہی ہے‘‘ حسن کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

’’میں جابر کے ساتھ مولانا سے ملنے گیا تھا اُنھوں نے مجھے اُس حملہ آور کے بارے میں بتایا جس نے اُس دن سٹیشن پر بم رکھا تھا وہ اسی علاقے میں چھپا ہوا تھا میں ابھی کچھ دیر پہلے اُسے اپنے ہاتھوں سے گولی مار کر آیا ہوں‘‘۔

آزاد کی بات سُن کر عمر اور حسن کے ہوش اُڑ گئے۔

’’کیا......ت......تم نے اُس شخص کو قتل کر دیا‘‘ عمر نے مشکل سے اپنے حواس سنبھالتے ہوئے کہا۔

’’ہاں وہ میرے بھائی اور اُن کے بیوی بچوں کا قاتل تھا اس لیئے میں نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار

دیا اور اسلام میں قتل کے بدلے قتل کی سزا ہے"۔

"لیکن اُسے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی تم اُسے پولیس کے حوالے بھی تو کر سکتے تھے" حسن کو اُس سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"وہ پولیس کی ناک کے نیچے چھپا ہوا تھا اگر پولیس کو اُسے پکڑنا ہوتا تو بہت پہلے پکڑ چکی ہوتی اور ویسے بھی وہ میرے بھائی کا قاتل تھا پولیس کا نہیں اس لیئے اُسے میں نے خود سزا دی ہے اور ہاں کل صبح ہوتے ہی تم لوگ یہاں سے چلے جانا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کے میں واپس نہیں جاؤں گا بلکہ میں اُن کے ساتھ مل کر کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد کروں گا" آزاد نے اُن دونوں کی طرف دیکھے بغیر اپنا فیصلہ سنایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہ دونوں وہیں کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

"جنت بی بی اُٹھ جاؤ میں آپ کے لیے آپ کا من پسند کھانا لے کر آئی ہوں" وہ غم کی شدت سے بے سُدھ ہو کر اپنے بستر پر آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھی کہ بانو ہاتھ میں ٹرے پکڑے اُس کے لیے کھانا لے کر آئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے تم جاؤ یہاں سے" اُس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جنت بی بی پچھلے تین دن سے آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا"۔

"اگر کھانا نہ کھاؤں گی تو کیا ہو گا" اُس نے اُسی انداز میں لیٹے ہوئے جواب دیا۔

"جنت بی بی آپ پہلے ہی اتنی کمزور ہو چکی ہیں کہ چلنا بھی محال ہو گیا اگر مزید بھوکی رہی تو......"۔

"مر جاؤں گی" اُس نے بانو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو"۔

"روح تو مر ہی چکی ہے بس یہ جسم باقی ہے اللہ کرے کہ یہ بھی مر جائے" اُس کی آواز رندھ چکی تھی۔

"جنت بی بی موت کی تمنا کرنا گناہ ہے حرام ہے"۔

"کتنا عجیب نظام ہے نہ اس کائنات کا جو لوگ موت کی تمنا کرتے ہیں اُنھیں موت آتی نہیں لیکن جو مرنا نہیں چاہتے موت اُن کو آن گھیر لیتی ہے"۔

”یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوتا ہے اور ہم کون ہوتے ہیں کہ اُس کی تقسیم پر اعتراض کرنے والے اور آپ ہی تو کہتی ہیں کہ اگر ہر انسان کو اپنی تمنا کی ہوئی چیز مل جائے تو پھر اللہ کو کون یاد کرتا ہ، شاید اسی لیے وہ اپنے بندوں کو تکلیف دیتا ہے تاکہ لوگ اُسے یاد کریں“ بانو اُس سے ہی سیکھی ہوئی باتیں دہرا رہی تھی۔

”میں تو ویسے بھی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتی تھی پھر اُس نے مجھے کیوں......؟“ اُس نے بانو کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”جنت بی بی مجھے آپ کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے آپ تو بالکل دیوانوں کی طرح باتیں کر رہی ہیں“۔

”جس انسان کے گھر میں شادی کی شہنائیاں بجنے والی ہوں پھر وہاں سے تین تین جنازے اُٹھ جائیں تو دیوانا ہو ہی جاتا ہے“ وہ ابھی تک پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔

”کچھ دن پہلے کتنی خوش تھیں آپ جب عمر صاحب کہ کراچی سے لوٹنے کی خبر ملی تھی پھر پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اور سب کچھ بدل گیا اور ایسا طوفان آیا جو آپ کی ساری خوشیاں تو اپنے ساتھ لے گیا اور بدلے میں پیاروں کی جدائی کا غم بھی دے گیا“ بانو نے کھانے کی ٹرے وہیں بستر پر رکھی اور زبردستی اُسے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی۔

جب وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تو بانو نے ایک نوالہ توڑ کر اُس کی طرف بڑھایا۔

” جنت بی بی میں جانتی ہوں کہ آپ کا غم بہت بڑا ہے اور یقیناً آپ جینا نہیں چاہتی لیکن اس طرح بھوکا رہ کر یا اپنی جان دے کر آپ اپنوں کا غم بانٹ تو نہیں سکتی بلکہ اُن کے زخموں پر ایک اور ضرب لگا دیں گی“۔

”تو پھر میں کیا کروں بانو نہیں برداشت کر سکتی میں“ وہ جھٹپٹا کر روتی ہوئی بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

”نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنا پڑے گا اپنے لیے نہیں تو روحا کے بارے میں سوچیے وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے وہ کیسے یہ سب برداشت کر رہی ہو گی اُسے اس وقت آپ کے سہارے کی ضرورت ہے“۔

”بانو ایک بات سچ بتاؤ کیا تم بھی عمر سے محبت کرتی تھی“ اُس نے بانو کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”عمر صاحب تھے ہی اتنے اچھے کہ کون اُن سے محبت نہیں کرے گا لیکن اب تو صرف ہم اُن کے لیے

مغفرت کی دعا ہی کر سکتے ہیں اس لیے میں بھی وہی کر رہی ہوں اور آپ بھی وہی کیجیے“ اُس نے کھڑکی سے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

”آپ فکر نہ کریں میں پوری کوشش کروں گا کے آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے“۔ ایس۔ ایچ۔ او اپنے تھانے کے باہر کسی سے بات کر رہا تھا کے اچانک کہیں سے گولی چلنے کی آواز سُنائی دی اور اس کے ساتھ ہی بھگدڑ مچ گئی‘ شور تھمنے کے بعد جب لوگوں نے دیکھا تو ایس۔ ایچ۔ او (SHO) زمین پر گرا ہوا تھا۔ وہ یہ سب کچھ تھانے کے سامنے سڑک کی دوسری جانب کھڑی ایک گاڑی کے پیچھے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ گولی لگنے سے SHO کی موت ہو چکی تھی اس وقت کچھ پولیس والے لاش کے پاس کھڑے تھے اور کچھ پولیس والے قاتل کی تلاش میں اپنے ارد گرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک پولیس والے کی نظر اُس پر پڑھ گئی جیسے ہی وہ پولیس والا اُس کی طرف بڑھا تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا پولیس والے نے اُس پر گولیاں بھی چلائی لیکن وہ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

”ہیلو جابر میں نے تمھارا کام کر دیا ہے لیکن پولیس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور اب وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں“۔ آزاد نے ایک جگہ رُک کر فون کیا۔

”اس وقت تم کہاں ہو“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں گھر کی طرف جا رہا ہوں لیکن ابھی راستے میں ہوں“۔

”تم ایسا کرو ابھی گھر جاؤ میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں پھر میں تمھیں ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دوں گا تمھارا گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے اُن کو تمھارے گھر کا پتہ معلوم ہے“ اُس نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن جلدی کرو میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا“ آزاد نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھا اور پھر سے بھاگنا شروع کر دیا۔

گھر پہنچ کر جیسے ہی آزاد نے دروازہ کھولا تو اُن دونوں کو سامنے دیکھ کر چونک گیا۔

”تم لوگ......میں نے تمھیں کہا تھا کے چلے جاؤ یہاں سے پھر تم لوگ ابھی تک گئے کیوں نہیں“ وہ غصے

سے لال پیلا ہورہا تھا۔

''جا رہے ہیں بس تمہارا انتظار کررہے تھے......آزاد تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے ہم تمھیں اس طرح موت کی وادی میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے'' عمر نے اُسکا ہاتھ پکڑ ادروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''جس سفر پر نکل چکا ہوں وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے'' اُس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی ہوا ہے اُس بارے میں کوئی نہیں جانتا ابھی بھی ہمارے پاس وقت ہے اس سے پہلے کے تم بہت دور نکل جاؤ ہم واپس چلتے ہیں''۔

''میں ابھی ابھی ایک پولیس والے کو قتل کر کے آیا ہوں اور اس وقت پولیس میرے پیچھے ہے اگر میں تم لوگوں کے ساتھ واپس چلا بھی جاؤں تو پولیس مجھے لاہور سے بھی گرفتار کر لے گی اس لیئے اب میں کہیں نہیں جاؤں گا اور ویسے بھی میرے تو نہ ماں باپ ہیں اور نہ ہی کوئی بھائی بہن تو پھر میں کس کے لیئے واپس جاؤں لیکن تمھارے پیچھے تم دونوں کا تو پورا خاندان ہے اس لیئے تم جاؤ اور لاہور جا کر ایک نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو'' آزاد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''لیکن ہم دونوں تمھارے دوست ہیں اور تمھارے بغیر کہیں نہیں جائیں گے'' حسن نے اُسے اپنا رشتہ یاد دلایا۔

''ضدمت کرو یار ابھی بھی وقت ہے اس سے پہلے کے پولیس یہاں پہنچ جائے تم دونوں چلے جاؤ''۔

وہ بات کررہے تھے کے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سُنائی دی اُس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور جابر کا نمبر ملایا۔

''کہاں ہو تم پولیس یہاں پہنچ گئی ہے''۔

''میں تمھارے گھر کے باہر ہوں تم پیچھے کے دروازے سے باہر آجاؤ''۔

''چلو جلدی کرو نکلو یہاں سے اور جتنی جلدی ہو سکے لاہور کے لیئے روانہ ہو جاؤ' میں بھی اب ہمیشہ کے لیئے یہاں سے جا رہا ہوں جابر نیچے میرا انتظار کررہا ہے''۔

''میں تمھیں جابر کے ساتھ نہیں جانے دوں گا تم بھی ہمارے ساتھ لاہور چلو گے وہاں جا کر جو ہو گا دیکھا

جائے گا'' آزاد واپس مڑنے لگا تو عمر نے ایک بار پھر سے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

''مجھے چھوڑ دو عمر میں جابر کی جماعت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکا ہوں''۔

''یہ جابر تمھارے لیئے اتنا ضروری ہو گیا ہے کے اس کے لیئے تم ہماری دوستی کو ٹھکرا رہے ہو''۔

''جس ملک میں قانون صرف نام کا ہو وہاں اپنا انتقام خود ہی لینا پڑتا ہے اُس دن ریلوے سٹیشن پر بم رکھنے والا میرا دشمن نہیں اصل دشمن تو وہ ہے جس نے یہ ساری منصوبہ بندی کی تھی اور مجھے تب تک سکون نہیں ملے گا جب تک میں اُسے جہنم واصل نہیں کر دیتا' اور تم لوگ بھول جاؤ کے تمھارا کبھی آزاد نام کا کوئی دوست بھی تھا'' آزاد نے عمر کو دھکا مارا تو وہ صوفے پر گر پڑا اور آزاد پیچھے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''اُٹھو عمر اُسے روکنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے وہ ہم سے بہت دور چلا گیا ہے اور اب ہمیں بھی واپس چلنا چاہیے'' حسن نے عمر کو اُٹھاتے ہو کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو حسن ہمیں واپس چلے جانا چاہیے اب یہاں کچھ نہیں رہا ہم کراچی میں خوشیوں کی تلاش میں آئے تھے لیکن اس روشنیوں کے شہر نے ہمیں دیا تو کچھ نہیں ہم سے ہمارا دوست بھی چھین لیا اور اس سے پہلے کے کچھ اور بُرا ہو یہاں سے چلتے ہیں''۔

''خبردار جہاں ہو وہیں کھڑے رہو اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اپنی جان سے جاؤ گے'' وہ دونوں اپنے بیگ اُٹھا کر وہاں سے جا رہے تھے کے پولیس نے چاروں طرف سے اُن کو گھیرے میں لے لیا۔

☆......☆......☆

''آزاد کی آنکھوں میں بھگاوت تو میں نے اُسی وقت دیکھ لی تھی جب وہ ایس ایچ او صاحب سے بات کر رہا تھا لیکن وہ اتنی جلدی اتنا بڑا قدم اُٹھائے گا میں نے سوچا نہیں تھا'' انسپیکٹر نے اُن سے تفتیش کرتے ہوئے کہا۔

''سوچا تو ہم نے بھی نہیں تھا سر کہ جن ہاتھوں میں کبھی قلم ہوتا تھا آج اُنہی ہاتھوں میں پستول ہو گی'' عمر کو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ آزاد کے گناہ میں تم لوگ شریک نہیں ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ یہ گناہ کر کہ وہیں گیا تھا جہاں سے تم دونوں گرفتار کیا گیا ہے اور یقیناً تم دونوں جانتے ہو کہ وہ کہاں گیا ہے''۔

''نہیں سر ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں گیا ہے'' حسن نے جواب دیا۔

''میں تم لوگوں سے پیار سے پیش آ رہا ہوں مجھے سختی کرنے پر مجبور نہ کرو بتا دو کہ آزاد کہاں چھپا ہے'' انسپیکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔

''سر میں سچ کہہ رہا ہوں ہمیں کچھ نہیں معلوم کے آزاد کہاں گیا ہے'' آزاد کا اب بھی وہی جواب تھا۔

''اس وقت تم دونوں جس تھانے میں ہو یہاں میری حکومت ہے اگر میں تم لوگوں کو جان سے بھی ماردوں تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی اس لیئے اگر تم لوگ اپنی خیریت چاہتے ہو تو صاف صاف بتا دو کے تمھارا وہ دوست کہاں ہے''۔

''سر...... ہمارا یقین کیجیے ہم نہیں جانتے کے وہ کہاں گیا ہے'' انسپیکٹر کو حسن کی بات پر یقین نہ آیا اور اُس نے حسن کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ جھڑ دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو اگر تم ہمیں نہیں بتاؤ گے تو کیا ہم اُسے پکڑ نہیں سکیں گے اُس نے ہمارے افسر کا قتل کیا ہے اب وہ اس ملک کے کسی بھی حصے میں چلا جائے ہم اُسے ڈھونڈ نکالے گے'' انسپیکٹر نے اُس کے بال پکڑ کر کھینچے

''آپ آزاد کو کیا ڈھونڈے گے سر وہ تو شاید یہ شہر ہی چھوڑ کر جا چکا ہے جبکہ آپ تو ریلوے سٹیشن پر بلاسٹ کرنے والے حملہ آور کو نہیں پکڑ سکے تھے جو اسی شہر میں آپ کی ناک کے نیچے چھپا ہوا تھا'' عمر نے اُسے للکارتے ہوئے کہا۔

''تم اُس حملہ آور کے بارے میں کیسے جانتے ہو''۔

''آپ کی اطلاع کے لیئے عرض ہے کے آزاد دو دن پہلے اُس حملہ آور کو بھی جہنم رسید کر چکا ہے''۔

''تلاش تو اُسے ہم کر ہی لیں گے لیکن اگر تم بتا دیتے تو صرف اُسے گرفتار کیا جاتا اور تم لوگوں کو بھی چھوڑ دیا جاتا لیکن اب ہم اُسے گرفتار نہیں کریں گے کیوں کے اب آزاد جہاں بھی نظر آیا اُسے گولی ماردی جائے گی اور تم لوگ بھی اپنی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو گے میں عدالت میں یہ ثابت کردوں گا کے آزاد نے جو بھی کیا تم لوگ بھی اُس کے ساتھ برابر کے شریک ہو''۔

''ہمارے ساتھ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں لیکن آزاد کا خیال اپنے دماغ سے نکال دیں اس وقت اُس کے

سر پر عجیب سا جنون سوار ہے وہ کسی کے روکنے سے نہیں رُکے گا اور جو کوئی بھی اُس کے راستے میں آیا اُسے وہ جان سے مار دے گا‘‘۔

’’آزاد کیا کرتا ہے وہ بعد میں دیکھیں گے لیکن ابھی تم یہ دیکھو کے میں تمھارے ساتھ کیا کرتا ہوں چلو بھائی جوانو اپنے مہمانوں کی اچھی طرح سے خاطر داری کرو‘‘ انسپیکٹر کا حکم ملتا ہی وہاں کھڑے ملازم اُن دونوں پر بھوکے شیر کی طرح کود پڑے اور چاروں طرف سے مکے، گھوسے اور لاتوں کی بارش شروع ہو گئی۔

☆......☆......☆

’’ہم انسان بھی کتنے بے وقوف ہوتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کے یہ دُنیا فانی ہے پھر بھی ہم اپنی ساری خوشیاں ساری اُمیدیں اسی دنیا سے وابستہ کرتے ہیں یہ کیوں نہیں سوچتے کے یہ دُنیا ایک دن فنا ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہم سب بھی، یہ جانتے ہوئے بھی کے ہمارے ساتھ وہی ہوگا جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے پھر بھی ہم انسان اپنے مستقبل کے بارے میں کیا کیا سُنہرے خواب دیکھتے ہیں کتنے بے وقوف ہوتے ہیں ہم انسان کتنے بے وقوف ہوتے ہیں‘‘۔ وہ کب سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے سوچ رہی تھی۔

’’عمر تم کہاں ہو......؟ کیا تم میری حالت دیکھ سکتے ہو؟ کیا تم محسوس کر سکتے ہو کے تمھارے بغیر میں کس طرخ زندگی گزار رہی ہو؟‘ ہم نے جنت میں رہنے کے خواب دیکھے تھے لیکن تمھارے بغیر یہ زندگی جہنم سے بھی بدتر ہے‘‘ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی سی بہنے لگی تھی۔ ’’خدا کی قسم اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی یہ زندگی ختم کر دیتی اور خود کو اس جسم کی قید سے آزاد کر کے تمھارے پاس چلی جاتی لیکن نہیں اس طرح بھی ہم نہیں مل سکتے کیونکہ خودکشی تو خرام ہے اور خودکشی کرنے والا تو تاقیامت جہنم کی آگ میں جلتا رہے گا اور تم تو شہید ہو اور شہید کو تو آگ چھو ہی نہیں سکتی تم تو یقیناً اس وقت جنت کے باغات میں ہو گے اس لیئے جب تک موت نہیں آتی میں یونہی تمھاری یادوں کے سہارے زندہ رہوں گی اور اس دن کا انتظار کروں گی جب موت مجھے زندگی کی قید سے آزادی دلا کر تم سے ملا دے گی‘‘ اُس نے اپنے آپ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر حوالات میں داخل ہوا تو وہ دونوں زمین پر آڑھے ترچھے پڑے ہوئے تھے عمر نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اُس کے پورے جسم میں درد کی لہر سی دوڑ گئی شاید کل رات کی دُھلائی سے اُن دونوں کی ہڈیاں بری طرح ٹوٹ چکی تھیں۔

''ہاں بھائی کیسی لگی میری مہمان نوازی ...... مجھے پورا یقین ہے کے کل رات جو کچھ ہوا اُس کے بعد تم لوگوں کی عقل ٹھکانے آ گئی ہو گی افسوس اگر تم پہلے میری بات مان لیتے تو یقیناً تمھاری ایسی حالت نہ ہوتی''۔

''کیا ...... کیا اس ملک میں ...... قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے کہاں کا قانون آپ کو ہمارے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرنے کی اجازت دیتا ہے'' اُس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''قانون کی پرواہ ہی کسے ہے اور ویسے بھی ہمارا کام تو مجرم سے جرم ثابت کروانا ہے اور اُس کے لیئے ہم مجرم کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کر سکتے ہیں اور اگر تم لوگ چاہتے ہو کے تمھارے ساتھ مزید برا نہ ہو بتا دو کے آزاد کہاں چھپا ہوا ہے''۔

''ہمارا جواب اب بھی وہی ہے ہم نہیں جانتے کے وہ کہاں ہے''۔

''تم لوگ آخر کس مٹی کے بنے ہوئے ہو'' انسپکٹر نے جیسے ہی مارنے کے لیئے اپنا ہاتھ اُٹھایا تو ایک زوردار دھماکے کی آوز سُنائی دی۔

''رانا ...... یہ آواز کیسی ہے'' اُس نے حوالدار کو آواز دی۔

''سر چار مسلح افراد نے تھانے کے مرکزی دروازے پر دستی بم پھینک کر دروازہ اُڑا دیا ہے اور اب فائرنگ کرتے ہوئے تھانے کے اندر داخل ہو گئے ہیں'' حوالدار نے اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا۔

حملہ آور یقیناً پورے تھانے کو تباہ نہیں کرنا چاہتے تھے کیوں کے دستی بم سے صرف تھانے کے مرکزی دروازے کو نقصان پہنچا تھا، اچانک ہونے والے حملے سے پولیس والوں کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا اور حملہ آوروں نے انسپکٹر کے علاوہ تھانے میں موجود تمام ملازمین کو فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ فائرنگ کے بعد دو حملے آور تھانے سے باہر آئے اور دیوار کے ساتھ کھڑی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ ایک نقاب پوش کی نظر اُن دونوں کی طرف پڑی تو وہ اگلے ہی لمحے اُن کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ انسپکٹر نے اپنی

پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن دوسرے نقاب پوش نے وقت ضائع کیے بغیر انسپکٹر کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا اور اب دونوں نقاب پوشوں نے اپنی بندوق کا رُخ عمر اور حسن کی طرف کر دیا اس وقت وہ دونوں بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اُن دونوں حملہ آوروں نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائے تو آزاد اور جابر کو اپنے سامنے دیکھ کر اُن دونوں کو اپنی بصارت پر یقین نہ آیا' عمر نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن درد کی شدت سے ہلنا بھی محال ہو رہا تھا آزاد اور جابر نے اُن دونوں کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اُنھیں اپنے ساتھ لے کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

☆......☆......☆

جابر اُنھیں وہاں سے نکال کر سیدھا مولانا کے پاس لے آیا لیکن اس بار اُن کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی' مولانا نے بڑی خوش دلی سے اُن کا استقبال کیا۔

''خوش آمدید میرے بچو: اوہ میرے خدایا کیا حال کر دیا ہے ظالموں نے تمھارا'' مولانا نے حسن کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مولانا اگر ہم ان کو وہاں سے نہ نکالتے وہ پولیس والے تو ان کو جان سے ہی مار ڈالتے'' جابر نے تھانے کے حالات کے بارے میں آگاہ کیا۔

''جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا مجھے اُس کا بھی بے حد افسوس ہے کتنا سمجھایا تھا اگر تم پہلے ہماری بات مان لیتے تو شاید آج تم لوگوں کی یہ حالت نہ ہوتی اور آزاد کا بھائی بھی زندہ ہوتا لیکن افسوس گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا لیکن اگر اب بھی تم ہمارے ساتھ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ تو تم بہت سے معصوم انسانوں کو مرنے سے بچا سکتے ہو'' مولانا نے اُنھیں ایک بار پھر سے اپنی جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے ظلم کے خلاف اس جنگ میں میں آپ کے ساتھ ہوں ایک بار پہلے بھی آپ کی بات نہ مان کر غلطی کر چکا ہوں اب دوبارہ نہیں کرنا چاہتا'' آزاد نے بڑے جوشیلے انداز سے کہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن میں یہ سب تمھارے دوستوں کے منہ سے سننا چاہتا ہوں''۔

''جو کچھ ان کے ساتھ ہو چکا ہے اُس کے بعد یقیناً ان دونوں کا بھی وہی فیصلہ ہو گا جو میرا ہے'' آزاد نے

پورے یقین سے کہا۔

''دیکھو اس وقت جو حالات ہیں تم اس ملک کے کسی بھی کونے میں چلے جاؤ پولیس تمھیں ڈھونڈ کر ہی رہے گی کیونکہ اُن کی نظر میں تم تینوں ہی گنہگار ہو اس لیئے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کے تم ہمارے ساتھ مل کر ظالموں کے خلاف جہاد کرو''۔

''ہم اس وقت کوئی بھی فیصلہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں'' عمر نے جواب دیا۔

میں جانتا ہوں کے اس وقت تم جہاد کے بارے میں تشویش کا شکار ہو لیکن تم خود سوچو ہمارے اس ملک ہر طرف دھماکے ہو رہے ہیں اب تو مسجد مندر ,گرجا گھر اور امام بارگاہیں بھی دشمنوں کے حملے سے محفوظ نہیں رہی تو کیا اس صورت میں ہم پر جہاد لازم نہیں' اگر ہم سب اسی طرح ظلم برداشت کرتے رہیں گے تو پھر اس ملک میں امن کیسے قائم ہوگا ہمارا دین جہاں محبت اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے وہیں ظالم کے خلاف جہاد کا بھی حکم دیتا ہے'' مولانا نے گرم لوہا دیکھ کر ہتھوڑا مارنے کی کوشش کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن......'' عمر کو فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''تم دونوں کو فیصلہ کرنے میں اس لیئے دقت ہو رہی ہے کیونکہ تمھارے دلوں میں اس دنیا کی محبت گھر کر گئی ہے لیکن یہ یاد رکھو کے یہ دُنیا ہمارا عارضی ٹھکانہ ہے اور ہمیں واپس اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے' تم لوگ ابھی کچھ دن ہمارے پاس رہو ہم تمھیں اسلام کی روح سے آشنا کروائیں گے اس کے بعد تمھارا جو فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قابل قبول ہوگا''۔

اُن دونوں کو علاج کی اشد ضرورت تھی اور حالات بھی ایسے تھے کے اُن کے پاس رہنے کے لیئے اس سے زیادہ محفوظ اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس لیئے اُنھوں نے وہاں رہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆......☆......☆

''تو پھر کیا ہوا......کیا وہ لڑکے اپنے زخم بھرنے کہ بعد واپس چلے گئے تھے'' میجر صاحب جاننے کے لیے بے چین تھے۔

''پورے دو مہینے لگے تھے اُن دونوں کہ زخم بھرنے میں......مولانا کو اندازہ ہو چکا تھا کے یہ لڑکے اسلام کے

بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے اس لیئے اُس نے اُنھیں قائل کرنے کے لیئے قرآنی آیات اور مختلف احادیث کی من گھڑت تشریح اور مفہوم کا سہارا لیا۔

''حیرت کی بات ہے صرف دو مہینوں میں اُس مولانا نے اُن کا برین واش کرلیا''۔

''ان دو مہینے میں اُنھیں ہر روز تین حصوں میں لیکچرز دیئے جاتے تھے پہلے حصے میں جہاد کی اہمیت اور اس دنیا فانی میں انسان کے عارضی قیام کے بارے میں دوسرے حصے میں شہادت کی قدرو منزلت اور آخری حصے میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کیا جاتا تھا اور ساتھ ہر روز اُنکے سامنے راشد اور اُن کے بیوی بچوں کی شہادت کا بھی ذکر کیا جاتا تھا جسے سُن کر وہ تینوں جوش میں آجاتے تھے''۔

''مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ وہ لڑکے ایمان کے اتنے کچے تھے کہ صرف دو مہینے میں ہی مولانا کہ جھانسے میں آ گئے''میجر صاحب غصے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''اُن لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کے زخم ابھی تازہ تھے اور مولانا کی باتوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا کا اُن پر ایسا اثر ہوا کے حسن اور عمر نے بھی اُن کے گروپ میں شمولیت کے لیئے رضامندی ظاہر کردی''۔

''اس طرح تو اس ملک کے بہت سے لوگ ہیں جن کے ذخم تازہ ہیں تو کیا وہ سب دہشتگرد ہو جائیں گے''میجر صاحب نے کرسی کی پشت پر ہاتھ مارا تو وہ سہم سی گئی۔

''خیر پھر کیا ہوا اُن کے ساتھ''میجر صاحب نے گفتگو کا انداز بدلتے ہوئے کہا۔

''اب جبکہ وہ لوگ جہاد میں شمولیت کے لیئے تیار ہو گئے تو مولانا نے اُن دونوں کو جہاد کی ٹریننگ کے لیے بھیج دیا''۔

''ٹریننگ کے لیئے بھیج دیا......کہاں......؟''۔

''اپنے ہیڈکوارٹر''۔

''کیا اُن کا ہیڈکوارٹر کسی اور جگہ تھا''میجر صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جی سر وہ مولانا جس جگہ رہتا تھا وہ بالکل سادہ سی جگہ تھی لیکن اُس کا ہیڈکوارٹر پہاڑی علاقے میں تھا جہاں اکبر نامی شخص ان جیسے لڑکوں کی ٹریننگ کرتا ہے اسی لیے مولانا کا حکم ملتے ہی جابر اُن کو وہاں سے اپنے ہیڈکوارٹر

لے گیا......"۔

☆......☆......☆

"اکبر یہ ہیں وہ نئے لڑکے جن کا مولانا نے تم سے ذکر کیا تھا یہاں پر میری ذمہ داری ختم ہوئی اب یہ تمھارے حوالے ہیں" جابر نے اُن کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ اکبر ہے ہمارے اس تربیتی کیمپ کا انچارج اب یہی تمھیں ہتھیار چلانا سکھائے گا اور اب تم لوگ یہیں رہو گے میرا اور تمھارا ساتھ یہیں تک تھا اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے"

جابر نے اُن تینوں کو اکبر کے سپرد کیا اور چلتا بنا۔ اکبر اُن کو ایک میدان میں لے گیا جہاں بہت سے لڑکے ہاتھوں میں جدید ہتھیار پکڑے ٹریننگ کر رہے تھے زیادہ تر لڑکوں کی عمریں 16 سے 25 سال کے درمیان تھیں

"کیا یہ سب بھی جہاد کے لیے ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں" عمر نے اکبر سے پوچھا۔

"ہاں یہ سب بھی جہاد کے لیے یہاں آئے ہیں یہ جو دائیں طرف ہیں یہ ابھی تمھاری طرح نئے ہیں اس لیئے ان کو بندوق چلانا سکھائی جا رہی ہے اور وہ جو بائیں جانب ہیں وہ بندوق چلانا سیکھ چکے ہیں اور اب اُنھیں بم چلانے کی تربیت دی جا رہی ہے" اکبر نے اُن سب کو معلومات دیتے ہوئے کہا۔

"ہماری ٹریننگ کب سے شروع ہوگی"۔

"ابھی تم لوگ لمبے سفر سے آئے ہو آج آرام کرو کل سے تم لوگوں کی ٹریننگ شروع ہوگی اور جب تمھاری ٹریننگ پوری ہو جائے گی تو تم لوگوں کو جہاد کے لیئے بھیجا جائے گا اکبر نے اُن سب کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

اگلے روز صبح سویرے اُن تینوں کو میدان میں اکٹھا کیا گیا اور اُن سے ہلکی پھلکی ورزش کروائی گئی اور یہ سلسلہ تین سے چار دن تک یونہی چلتا رہا' چار دن کے بعد عمر اور حسن کو ٹریننگ کے لیئے نائن ایم ایم پسٹل اور رضوان کو مشین گن دی گئی۔

"رضوان بھی تو ہمارے ساتھ ہی ٹریننگ کرنے کے لیئے آیا ہے تو پھر اُس کی ٹریننگ ہم سے الگ کیوں ہو رہی ہے"۔ عمر سے پوچھے بغیر رہا نہ گیا۔

"اُس کی ٹریننگ الگ نہیں ہو رہی اُسے مشین گن اس لیئے دی گئی ہے کیوں کے تم لوگ ابھی نئے ہو اور وہ

پہلے پستول چلا چکا ہے اور ہاں کل سے تمھارے ساتھ ایک اور لڑکا ٹریننگ کرے گا‘‘۔

’’کون ہے وہ اور کیا نام ہے اُس کا‘‘ حسن سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

’’تمھیں اس سے کیا لینا دینا کے وہ کون ہے وہ بس کچھ عرصہ تمھارے ساتھ ٹریننگ کرے گا اور پھر جہاد پر چلا جائے گا اس لیئے تم صرف اپنی ٹریننگ پر توجہ دو‘‘۔ اکبر رُعب دار آواز میں کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہ دونوں نشانہ لگانے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

’’یقین نہیں آتا کہ اتنا نیک اور معزز بندہ اور ایسی حرکات‘‘ میجر صاحب کو ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

’’درحقیقت جابر اور مولانا ایک دہشتگرد گروپ سے تعلق رکھتے ہیں وہ پاکستان کے دشمنوں سے پیسے لے کر ملک میں دہشت گردی پھیلاتے ہیں‘ جابر نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر مولانا کے پاس لے کر آتا ہے اور پھر مولانا اپنی باتوں اور تقریروں سے نوجوانوں کو جہاد کے نام پر گمراہی کی طرف مائل کر لیتا ہے اور جب وہ راضی ہو جاتے ہیں تو وہ اُن سب کو اپنے ہیڈ کوارٹر بھیج دیتا ہے جہاں اکبر اُن لڑکوں کو بندوق اور بم چلانے کی ٹریننگ کرواتا ہے اور جب نوجوان تیار ہو جاتے پھر مولانا اُن لڑکوں سے معصوم لوگوں کو یہ کہہ کر قتل کروا دیتا کے یہ لوگ ملک کے دشمن ہیں اور جب اُسے لگتا کہ یہ لڑکے اب زیادہ کام کہ نہیں تو اُن نوجوانوں کو جنت کا لالچ دے کر اُن سے خودکش حملے کرواتا ہے‘‘ وہ ایک ہی سانس میں بولے جا رہی تھی۔

’’مجھے تو اس بات پہ حیرت ہو رہی ہے کہ تم اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہو......‘‘؟۔

سر میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ اُن نوجوانوں میں سے ایک میرا شوہر ہے اور میں اُن کی ساری کہانی جان چکی ہوں اسی لیے آپ کے پاس مدد کے لیے آئی ہوں‘‘۔

’’توبہ ہے کیا ہمارے نوجوان اتنے کمزور ہیں کہ کوئی بھی اُنھیں اپنے جال میں پھنسا سکتا ہے‘‘ میجر صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

’’مولانا جیسے لوگ اُن لڑکوں کو ہی اپنا شکار بناتے ہیں جو بے روزگار ہوں یا پھر اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے‘‘۔

’’پاکستان جیسے اسلامی ملک میں پیدا ہونے کے باوجود بھی اسلام کے بارے میں نہ جاننا یہ بات توسمجھ سے بالاتر ہے‘‘اس وقت غم اور غصے کی ملی جلی حالت میں تھے۔

’’سر آجکل ہم ماڈرن بننے کی کوشش میں بہت آگے نکل چکے ہیں سکول سے لے کر کالج تک ہمیں گوروں کی باتیں تو بتائیں جاتیں لیکن ہمارے اسلامی ہیروز کے بارے میں کہیں بھی کوئی معلومات نہیں دی جاتی‘ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو پاکستانی چینلز پر اللہ اور اُس کے رسول کی باتوں کی بجائے ناچ گانا ہورہا ہوتا ہے اور تو اور اگر کوئی ہندو اداکار اس دنیا سے چلا جائے تو ہمارا میڈیا سارادن اس طرح اُن کی یاد میں گن گا تا رہتا ہے جیسے ان کا کوئی اپنا رشتہ دار کا انتقال ہو گیا ہو لیکن ہر سال ہمارے صحابہ کرامؓ اور ہمارے قومی ہیروز جیسے کہ غازی علم دین شہید اور عامر چیمہ شہید کے یوم پیدائش اور یوم شہادت خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور کوئی چینل ان کا ذکر تک کرنا گوارہ نہیں کرتا‘‘۔

’’یہ امر تو واقعی ہمارے لیے لمحہ فکر یہ ہے‘‘ میجر صاحب نے بھی اُس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

’’وہ تینوں بھی اسی ماحول میں پروان چڑھے تھے جس طرح بہت سارے نوجوان جنت کی چاہت میں اپنی دنیا اور آخرت برباد کر چکے تھے اب وہی سب یہ تینوں بھی کررہے تھے۔

’’پچھلے ایک سال میں بہت کچھ بدل چکا تھا وہ چاروں معصوم لڑکوں سے نامور دہشتگرد بن چکے تھے‘‘۔

’’چار......لیکن وہ تو تین تھے پھر یہ چوتھا کہاں سے آگیا‘‘۔

’’بلال سے اُن کی ملاقات مولانا کہ ہیڈکوارٹر میں ہوئی تھی ٹریننگ پوری ہونے کہ بعد اس سفر کی شروعات آزاد اور بلال نے ہی کی تھی‘‘۔

’’اُن دونوں نے کیا کیا تھا......؟‘‘۔

’’مولانا نے سب سے پہلے اُن کے ہاتھوں ایک سیاست دان کو قتل کروایا تھا جیسے ہی وہ شخص خطاب کرنے آیا تو بلال نے اُس آدمی کو گولی مار کر قتل کر دیا اور وہ دونوں وہاں سے فرار ہو گئے اور پھر مولانا نے غدار کا لفظ استعمال کر کے اُن سے بے شمار قتل کروائے کبھی کسی مسجد سے نکلتے ہوئے لوگوں کو یہ کہہ کے قتل کروا دیا کے یہ غدار ہیں تو کبھی بازار میں کھڑے معصوم بے گناہ کو یہ کہہ کے قتل کروا دیا کے یہ دہشتگردوں کا ساتھی ہے‘‘ وہ روہانسی ہوگئی

تھی۔

''اچھا وہ......کیا نام تھا اُس لڑکی کا......جنت......جنت کا کیا ہوا'' میجر صاحب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''جنت......''۔

☆......☆......☆

شام کو دفتر سے آتے ہی وہ ہال میں پڑے ہوئے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا' اُس نے اپنا سر صوفے کی پشت سے لگایا اور منہ چھت کی طرف کر کے آنکھیں موندلیں۔

''تھک گئے ہو بیٹا'' امی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی امی آج دفتر میں بہت کام تھا'' امی کو دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اسد بیٹا تمھارے ابو کی وفات کے بعد بہت اکیلی ہو گئی ہوں تم بھی سارا دن دفتر میں ہوتے ہو تمھارے بغیر یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے'' وہ بھی اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''امی آپ کی تنہائی کا احساس ہے مجھے لیکن ابو نے بینک سے جو قرض لیا تھا اس مہینے اُس کی آخری قسط بھی ادا ہو جائے گی پھر میں کوشش کروں گا کے زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزار سکوں اور تب تک میں ایسا کرتا ہوں کے فریال کو بُلا لیتا ہوں'' اُس نے امی کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

''فریال کو رہنے دو بیٹی اگر اپنے گھر میں خوش رہے تو ماں باپ کو زیادہ خوشی ہوتی ہے بیٹا میں چاہتی ہوں کے تم شادی کر لو اس طرح میری تنہائی بھی ختم ہو جائے گی''۔

''امی آپ کے نام پر کمپنی کھولنا ابو کی آخری خواہش تھی اور جب تک میں اُن کی اس خواہش کو پورا نہیں کر لیتا میں شادی نہیں کر سکتا''۔

''اسد تمھارے ابو کی وفات کے بعد ایسا لگتا تھا جیسے اب سب کچھ ختم ہو جائے گا لیکن تم نے جس طرح گھر اور کاروبار کو سنبھالا ہے یقیناً وہ تم سے بہت خوش ہونگے اور رہی بات اُن کی خواہش کی تو وہ یہ سب میری خوشی کے لیئے کرنا چاہتے تھے بیٹا اس وقت میری خوشی تمھاری شادی میں ہے'' اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے اُس کے بال

سہلاتے ہوئے کہا۔

''امی آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ کوئی لڑکی پسند کر چکی ہیں'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

''اسد میں نے تمھارے لیئے جنت کا رشتہ مانگ لیا ہے پہلے بھی میں نے اُن سے بات کی تھی لیکن اُس وقت مجھے پتا چلا کے جنت کی منگنی اُس کے کزن سے بچپن میں ہی کر دی گئی تھی لیکن اب وہ لڑکا اس دنیا میں نہیں رہا تو اس لیئے اب اُن کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے امی اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ جب کہیں میں شادی کے لیئے تیار ہوں''۔

''جیتے رہو بیٹا اللہ تعالیٰ تمھیں خوش رکھے مجھے تم سے یہی اُمید تھی'' اُس کی ایک ہاں سے امی کی چہرے پر پھیلنے والی خوشی دیدنی تھی اور اسد اپنی امی کی خوشی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''بھابی میں جانتی ہوں کے پچھلے ایک سال میں ہم پر جو قیامت گزری ہے اُس کے بعد ایسی باتیں کرنا مناسب نہیں ہے لیکن کسی کے چلے جانے سے زندگی نہیں رُکتی یہ وقت کسی کے لیئے نہیں ٹھہرتا اور انسان کو سب کچھ بھلا کر آگے چلنا ہی پڑتا ہے''۔

''ایک سال گزر چکا ہے اس بات کو لیکن آج بھی وہ دردناک منظر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کے ہماری زندگی میں ایسا دن بھی آئے گا عمر کی کراچی سے واپسی کا سُن کر کتنے خوش تھے ہم سب لیکن پھر اُس ایک خبر نے ہماری ساری خوشیاں چھین لی اور دل پر ایسے زخم لگائے کے''۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابھی لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا'' جنت کی امی نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایک سال گزر چکا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کے جیسے کل کی بات ہو'' اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سب کی کتنی خواہش تھی کے عمر اور جنت کی شادی ہو لیکن آپ بھی جانتی ہیں کے اب ایسا ممکن نہیں"۔

"شاید اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ جنت میری بہو بنے' خیر تم کہو زینب کیا کہنا چاہتی ہو" اُنھوں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں بھابی جنت میری بیٹی ہے اور میں جانتی ہوں کہ آپ اُسے مجھ سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں اس لیے آپ میری بات اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں" اُنھون نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھی نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو" اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"دیکھیں بھابھی میں چاہتی ہوں کے آپ جنت کو سمجھائیں کے عمر اُس کا ماضی تھا اب وہ اُسے بھول جائے اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچے' عمر اب ہمارے درمیان نہیں ہے اور میں نہیں چاہتی کے وہ اپنی ساری زندگی عمر کی یادوں کی نظر کردے" بالآخر اُنھوں نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی تھی۔

"سچ کہا تم نے عمر جا چکا ہے اور اب کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئے گا اس لیئے تم جہاں چاہو اپنی بیٹی کی شادی کر سکتی ہو" اُنھوں نے بھی دکھی دل سے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"بھابی جنت کی ممانی اپنے بیٹے اسد کے لیئے اُس کا رشتہ مانگ رہی ہے اُنھوں نے پہلے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن ہم نے انکار کر دیا تھا لیکن عمر کی موت کے بعد اب پھر وہ اصرار کر رہی ہیں"۔

"تو اس کا مطلب تم نے فیصلہ کر لیا ہے"۔

"بھابی اسد ایک بہت اچھا لڑکا ہے اس لیئے میں چاہتی ہوں کے جنت اس رشتے کے لیئے مان جائے اور ایسا صرف تب ہی ہو سکتا ہے اگر آپ اُس سے بات کریں" اُنھوں نے جذبات کا سہارہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو میں اُس سے بات کروں گی انشااللہ وہ مان جائے گی" بڑی امی نے اُنھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"انشااللہ" زینب نے بھی منہ میں دہرایا۔

☆......☆......☆

"السلام وعلیکم بڑی امی کیسی ہیں آپ" اُس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

''میری چھوڑو بیٹا بس زندگی کے دن پورے کرنے ہیں سو ہو رہے ہیں تم کیسی ہو'' جنت کو دیکھ کر وہ چارپائی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں......اچھا دوائی لی آپ نے'' وہ بھی اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

''ہاں بھئی لے لی ہے دوائی......ویسے جنت بیٹا جس طرح تم میرا خیال رکھتی ہو کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں تم پر بوجھ بن گئی ہوں''۔

''نہیں بڑی امی یہ کیا کہہ رہی ہیں'' یہ بات سُن کر اُس کو دھچکا سا لگا تھا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں تم روز یہاں آتی ہو میری دوائیاں لاتی ہو میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہو''۔

''بڑی امی یہ تو میرا فرض ہے'' اُس نے دوائی شاپنگ بیگ سے نکالتے ہوئے کہا۔

''جنت بیٹا یہ تمھارا نہیں عمر کا فرض تھا'' اُنھوں نے اُسے یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''عمر کہ جانے کہ بعد اُس کا ہر فرض میرا ہے''۔

''اور یہ فرض کب تک نبھاؤ گی''۔

''مرتے دم تک''۔

''کس حیثیت سے'' اُنھوں نے جواب طلب سے جنت کی طرف دیکھا۔

''بڑی امی یہ آپ پوچھ رہی ہیں'' اُس کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

''نہیں یہ سب دنیا والے پوچھیں گے تم سے کہ آخر کس حیثیت سے تم میرے مرحوم بیٹے کہ فرائض سر انجام دے رہی ہو''۔

''ہاں تو بتا دوں گی کہ میں محبت کرتی تھی اُس سے ہماری شادی ہونے والی تھی'' اُس نے دوائی اُن کے ہاتھ پہ رکھی اور پانی کا گلاس اُن کی طرف بڑھایا۔

''ہونے والی تھی......ہوئی نہیں تھی جو تم اپنی ساری زندگی کو زنگ لگا رہی ہو......، جنت بیٹا اپنی خالت دیکھو سجنے سنورنے کی عمر میں تم بیوا جیسی زندگی گزار رہی ہو''۔

''میری زندگی کو زنگ اُسی دن لگ گیا تھا جس دن میں نے عمر کی موت کی خبر سُنی تھی......'' اُس نے آنکھوں

سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے کسی کے چلے جانے سے زندگی نہیں رُکتی ایک سال ہو گیا ہے عمر کو گئے ہوئے اب بس کرو اس کی یاد میں سوگ منانا اور اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرو''۔

''تو آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں کسی اور سے شادی کر کہ عمر سے بے وفائی......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔

''یہ وفا اور بے وفائی اس دنیا کی باتیں ہیں اور وہ تو کب کا اس دنیا سے دور جا چکا ہے''۔

''لیکن میرے لیے وہ آج بھی زندہ ہے میری یادوں میں......اور میں اُن یادوں کے سہارے اپنی پوری زندگی گزار سکتی ہوں'' آنسوؤں سے اُس کے گال پوری طرح تر ہو چکے تھے۔

جب اُنھوں نے دیکھا کہ جنت نہیں مان رہی تو اُنھوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور زور زور سے سانس لینے لگی۔

''بڑی امی کیا ہوا......؟؟'' وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا گئی۔''بڑی امی چلیں میں آپ کو ہاسپٹل لے کہ چلتی ہوں''۔

''نہیں بیٹا مجھے کہیں نہیں جانا مر جانے دو مجھے میری وجہ سے ہی تم اپنی زندگی برباد کر رہی ہو''۔

''نہیں بڑی امی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ غلط سمجھ رہی ہیں''۔

''میں جانتی ہوں...... تمھیں......یہی فکر ہے کہ......تم چلی جاؤ گی تو......میرا خیال کون رکھے گا......اسی لیے تم شادی نہیں کرنا چاہتی'' اُنھوں نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میرا یقین کریں بڑی امی میری شادی نہ کرنے کی وجہ آپ نہیں ہیں''۔

''تو پھر تم اپنی ماما کی بات کیوں نہیں مان لیتی''۔

''یہ ان سب باتوں کا وقت نہیں ہے آپ اُٹھیے اور میرے ساتھ چلیے'' اُس نے اُنھیں اُٹھانے کی ناکام کوشش کی۔

''نہیں جب تک تم مجھ سے وعدہ نہیں کرتی کہ تم اپنی ماما کی بات مان لو گی میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی

چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے" بڑی امی اس وقت کمال مہارت سے اداکاری کے جوہر دکھا رہی تھیں۔
"بڑی امی پلیز جو کام میں نہیں کرسکتی اُس کے لیے مجھے مجبور نہ کریں"۔
"تو پھر ٹھیک ہے چلی جاؤ"۔
"نہیں بڑی امی میں آپ کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں روزِ محشر عمر کو کیا منہ دکھاؤں گی" اُس نے روتے ہوئے کہا۔
"تو پھر وعدہ کرو" اُنھوں نے بمشکل سانس لیتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتی ہوں جو آپ کہیں گی میں وہی کروں گی" اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہار مان لی۔

☆......☆......☆

"آؤ میرے بچو" دروازے پر دستک ہوئی تو مولانا نے اُنھیں اپنے سامنے دیکھ کر خوش آمدید کہا۔
"مولانا آپ نے ہمیں بلوایا تھا"۔
"ہاں میں نے تمھیں اس لیے بلوایا ہے کہ ابھی ابھی مجھے خبر ملی ہے کہ اتوار کے روز ایک وزیر شہر میں جلسہ کرنے والا ہے"۔
"تو یہ سب آپ ہمیں کیوں بتا رہے ہیں" عمر نے سوالیہ نگاہوں سے مولانا کی طرف دیکھا۔
"وہ اس لیے کہ یہ وزیر دہشتگردوں کا سب سے بڑا پشت پناہ ہے یہی وہ شخص ہے جو ان لوگوں کو قانون کی گرفت سے بچاتا ہے"۔
"تو آپ کیا چاہتے ہیں" حسن نے پوچھا۔
"میں یہ چاہتا ہوں کہ کل ہمارے پاس بہت سنہری موقع ہے یہ وزیر جلسے میں آئے تو واپس نہ جا سکے اور اُس کے ساتھ اُس کے اور بھی ساتھی ہوں گے اس لیے تمھیں اُس وزیر کو بم سے اُڑا کر جہنم واصل کرنا ہوگا"۔
"کیا بم سے اُڑانا ہوگا لیکن ایسے تو بہت سارے لوگ مارے جائیں گے" عمر نے حیرت سے مولانا کی طرف دیکھا۔

''نہیں تمھیں دستی بم سے حملہ کرنا ہوگا اور اس بم سے صرف اُس کے آس پاس کے لوگوں کو نقصان ہوگا اور وہ سب بھی اُس کی طرح ملک کے دشمن ہونگے مولانا نے کہا۔

''لیکن ہوسکتا ہے وہ لوگ اسلام کے دشمن نہ ہوں'' حسن نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اگر وہ اُس غدار کے ساتھی نہ ہوتے تو اُس کے ساتھ کیوں ہوتے'' مولانا نے اس طرح سخت لہجے میں کہا کے وہ لاجواب ہوگئے۔

''ٹھیک ہے ہمیں کب جانا ہے'' عمر نے حکم کی تائید کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل جانا ہے ابھی تم لوگ جاؤ اور جا کر تیاری کرو'' مولانا نے اُنھیں حکم دیتے ہوئے کہا۔

دوپہر دو بجے کے قریب عمر اور حسن نے مولانا سے اجازت لی اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلے گئے اور پھر رات آٹھ بجے مولانا نے ایک نیوز چینل پر خبر سُنی کے آج ایک وزیر جلسے کے دوران بم پھٹنے سے ہلاک ہوگئے اور اُن کے ساتھ دس افراد مارے گئے۔ مولانا یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ آزاد بھی یہ خبر سُن چکا تھا اس لیئے اُن دونوں کے لیئے پریشان تھا رات گیارہ بجے کے قریب عمر اور حسن واپس آگئے۔

''تم دونوں ٹھیک تو ہو اتنی دیر کہاں لگادی تم نے'' آزاد نے اُن دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں ہم ٹھیک ہیں'' حسن نے جواب دیا۔

''شاباش میرے بچوں تم نے ایک غدار کر ختم کیا ہے تم لوگ مبارکباد کے مستحق ہو''۔

''ہم نے وہی کیا جو آپ نے کہا'' عمر نے مولانا سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ اب تک تم نے جو کیا ہے یقیناً تعریف کے قابل ہے اور میں یہ بات فخر کہ ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جتنے کافروں کو تم چاروں نے جہنم واصل کیا ہے یقیناً تم لوگ جنت کے مستحق ہو'' اُس نے اُن کو شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب وقت آگیا ہے جب تم لوگوں کو جہاد کے لیے سب سے قیمتی چیز پیش کرنی ہوگی''۔

''کیا مطلب'' عمر نے پوچھا۔

''تم لوگوں کو جتنا اس دنیا میں دکھ تکلیف اور مصیبتوں کا سامنا کرنا تھا تم کر چکے لیکن اب وہ وقت دور

نہیں جب تم سب اس فانی اور آزمائش سے بھری زندگی سے نجات پا کر ابدی اور راحتوں سے بھری زندگی حاصل کرنے جا رہے ہو جہاں جنت کی خوبصورت حوریں تمھارا انتظار کر رہی ہیں"۔

"ہم جہاد کے لیے کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے" آزاد نے پر جوش انداز میں کہا۔

"شاباش میرے بچوں مجھے تم سے یہی اُمید تھی کے تم لوگ اس کام کے لیئے تیار ہو جاؤ گے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کے تمھاری قربانی ضائع نہیں جائے گی" مولانا نے اُس کی پیٹ تھپ تھپائی۔

مولانا بہت خوش تھا کے لڑکے بڑی آسانی سے تیار ہو گئے ہیں اور وہ تو جلد از جلد اس کام کو کروانا چاہتا تھا لیکن یہ کام تو تب ہی ہونا تھا جب مولانا کو ہیڈ کوارٹر سے حکم ملتا۔

☆......☆......☆

"یار رات سے صبح ہونے والی ہے پتا نہیں یہ لڑکی میجر صاحب کو کونسی داستانیں سُنا رہی ہے" اُس کی نظریں بار بار اُسی لڑکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"مینوں تو لگدا اے بھائی کوئی بہت ہی ضروری گل اے"۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے اسی لیے تو میجر صاحب بھی اتنی توجہ سے اُس کی بات سُن رہے ہیں......لیکن کیا بات ہو سکتی ہے" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے سکھوندر کی طرف دیکھا۔

"چھڈ یارا گر تیرے کام کی ہوگی تو میجر صاحب تینوں وی دس دین گے"۔

"لیکن اگر وہ لڑکی بتا دیتی تو کیا بات تھی"۔

یار تیری نظر بار بار اُس بی بی تے کیوں جاندی اے" سکھوندر نے بھی اُس کی حرکت کو بھانپ لیا تھا۔

"جس طرح تجھے بار بار سمجھانے پر پنجابی بولنے کی عادت نہیں جاتی اسی طرح میری نظر بھی اُس سے نہیں ہٹتی" اُس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"یار تو چاہتا کیا ہے"

"صرف ایک سوال کا جواب"۔

"کونسا سوال"۔

”آخراس معصوم چہرے والی لڑکی کا دہشتگردوں سے کیا تعلق ہے“۔

”مجھے لگتا ہے کہ اُس نے میجر صاحب کو بتا دیا ہوگا تو یہاں پہرہ دے میں میجر صاحب سے پوچھ کر آتا ہوں“۔

”ابے مروائے گا کیا“ سکھوندر جیسے ہی آگے بڑھنے لگا زوہیب نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تو پھر بکواس بند کر اور چپ چاپ پہرہ دے کب سے ایک ہی بات کیے جا رہا ہے“ سکھوندر نے زوہیب کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

آخرکار وہ دن بھی آ ہی گیا جب مولانا نے اُن چاروں کو الگ الگ اپنے پاس بلایا اور اُن سب کو مختلف دعائیں اور جنت کی بے شمار نعمتوں کا حوالہ دے کر اُن سب کو الگ الگ شہروں میں بم بلاسٹ کرنے کے لیئے قائل کرنے کی کوشش کی۔

آزاد، حسن اور بلال تو مان گئے کیوں کے وہ مولانا پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے تھے لیکن عمر نے مولانا کے لیے مشکل پیدا کر دی۔

”مبارک ہو تم بہت خوش قسمت ہو کہ تم جنت حاصل کرنے جا رہے ہو ہمیں سالوں ہو گئے اس تنظیم میں لیکن آج تک ہمیں یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی لیکن کل تم یہ سعادت حاصل کرنے جا رہے ہو“ مولانا نے عمر کو خودکش جیکٹ دیتے ہوئے کہا۔

”کل اس جیکٹ کو پہن کر تم کراچی جاؤ گے اور وہاں ایک کالی بھیڑ کے گھر کے سامنے جا کر خود کو اس سے اُڑا لو گے“۔ یہ سن کر عمر حیران ہو گیا......

”لیکن یہ تو خودکشی ہے اور اسلام میں خودکشی حرام ہے“ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عمر نے مولانا سے سوالیہ انداز میں کہا۔

”یہ خودکشی نہیں ہے جہاد ہے اگر تم اُس کو گولی مارنے کی کوشش کرو گے تو وہاں اتنی سیکیورٹی ہوگی کے تم کامیاب نہیں ہو سکو گے اور خود مارے جاؤ گے......، اس لیے بہتر ہے کے تم بم bomb سے حملہ کرو اس طرح

تم اُس غدار کو مارنے میں کامیاب ہو جاؤ گے" مولانا نے عمر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن اسطرح تو اُس کے ساتھ اُس کے سیکیورٹی گارڈ بھی مارے جائیں گے ہوسکتا ہے کہ وہ اُس کے ساتھی نہ ہوا ور صرف اپنا فرض نبھا رہے ہوں" عمر بھی خاضر دماغ تھا۔

"اُس کے تمام سکیورٹی گارڈز بیرون ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ اُسے ملک دشمنوں کی ہی عنایت ہے"۔

"لیکن وہاں آس پاس بہت سارے گھر ہونگے جن میں بچے اور بوڑھے سب ہی ہونگے اور ہمارے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ نے تو حالت جنگ میں بھی بچوں، عورتوں اور ضعیفوں پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے اس لیئے میں اُنھیں نہیں مار سکتا" عمر نے ایک بار پھر انکار کیا"۔

"نہیں میرے بچے وہ شخص ایک پوش علاقے میں بڑے سے بنگلے میں رہتا ہے اُس کے چاروں طرف سو میل تک اور کوئی گھر نہیں ہے اور اس بم سے صرف اُس کا وہ اڈاہ تباہ ہوگا جہاں پر وہ اسلام کے دشمنوں سے سودا بازی کرتا ہے"۔

"لیکن......" اُس کا دل اب تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"تمھارے دل میں اُن لوگوں کے لیے رحم آرہا ہے جو ہمارے مسلمان بھائیوں اور بیٹوں کو قتل کرتے ہیں جو ہماری بہنوں اور بیٹیوں سے زیادتی کرتے ہیں میں جانتا ہوں کے یہ سب کافر کرتے ہیں لیکن ہمارے ملک کی یہ کالی بھیڑیں اُن کافروں سے پیسے لیکر اُن کا ساتھ دیتے ہیں، یہ مسلمان نہیں منافق ہیں اور اگر تم اُن کے لیے رحم رکھتے ہو تو تم بھی منافق ہو" جب مولانا نے دیکھا کے عمر اُس کے جھانسے میں نہیں آرہا تو اس نے عمر کو جذباتی طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے میں جانے کہ لیے تیار ہوں" مولانا کی یہ دلیل سن کر عمر جذباتی ہو گیا اور مولانا سے جیکٹ لے کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆......☆......☆

کل وہ چاروں ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والے تھے اس لیے آج رات وہ سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے اپنے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔

''غور سے دیکھو آسمان کو چاندنی رات میں یہ ستارے چاند کی روشنی میں کیسے خوشی سے جگمگا رہے ہیں
''عمر نے اُن سب کی توجہ آسمان کی طرف کروائی۔

''ہاں کیونکہ آج کافی دنوں بعد ستاروں کو چاند کا دیدار ہوا ہے اور اسی طرح ہم سب بھی کل پتا نہیں کتنے دن بھٹکنے کے بعد اپنے رب کے حضور حاضر ہونگے پھر ہم بھی یہی سکون اور خوشی محسوس کریں گے جو آج یہ ستارے کر رہے ہیں'' بلال آنکھیں بند کر یوں منظر بیان کر رہا تھا جیسے وہ محسوس کر رہا ہو۔

''پتا نہیں تم لوگوں کے چہرے پر مجھے ایک عجیب سے سکون نظر آ رہا ہے لیکن میر دل بے چین ہے، مجھے وہ خوشی کیوں محسوس نہیں ہو رہی جو تم لوگ محسوس کر رہے ہو'' عمر کی بے چین نظریں اُن سے سوال کر رہی تھی۔

''شائد اس لیے کہ تم ابھی جینا چاہتے ہو'' حسن نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے اُسے گھورا۔

''جینا کون نہیں چاہتا یار''۔

''میں تو نہیں چاہتا......اور ویسے بھی جس طرح سے ہم جی رہے ہیں اس زندگی سے موت ہی بہتر ہے
''آزاد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

آزاد کی یہ بات اُن کے سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے بھی مزید کسی نے بحث نہیں کی۔

''اچھا بلال ہمارے بارے میں تو تم جانتے ہوں لیکن یہ بتاؤ تم یہاں کیسے آئے'' حسن نے خاموشی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''میں افغانستان کے علاقے میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ دو سال پہلے کی بات ہے ایک دن میں گھر سے باہر کھیلنے کے لیے گیا...... جب واپس آیا تو میرے گھر میں ہر طرف آگ ہی آگ تھی......دیکھنے والوں نے بتایا کے یہاں سے ایک طیارہ گزرا جس نے آگ کا گولہ برسایا اور اُس آگ نے میرے پورے خاندان کو شہید کر دیا'' اُس کی آواز رندھی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ سب بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''میں تو اُس دن خود بھی مر جانا چاہتا تھا لیکن پھر ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب نے مجھے خودکشی کرنے سے روک لیا۔ میرے چچا زاد بھائی جہاد کرتے تھے اس لیئے میں بھی اُن کے ساتھ یہاں آ گیا تا کے اُن ظالموں سے بدلا لے سکوں'' اُس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔

''بہت دُکھ ہوا یہ سن کر یار'' حسن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

''اللہ تعالیٰ تمارے خاندان والوں کی بخشش فرمائے اور اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے'' آزاد نے اُس کے خاندان کی تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

''بلال تمھارے ساتھ جو ہوا بہت برا ہوا......لیکن یار کم از کم تمھیں یہ تو پتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ایک ہم ہیں دو سال ہو گئے اپنے پیاروں کی کوئی خبر ہی نہیں'' اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اب تک تو ابا ریٹائر ہو چکے ہونگے اور بھائی کا بیٹا جو اُس وقت اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا تھا اب تو اپنے پیروں پر چلتا ہوگا بلکہ بھاگتا ہوگا'' حسن نے نم آنکھوں سے اپنے خیالات کے جال بنانے شروع کیے۔

''ہاں یار میری گڑیا بھی اب بڑی ہوگئی ہوگی امی اور بابا کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی ہوگی'' عمر نے بھی اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے گھر والوں کو یاد کرنے لگا۔

''اور جنت'' حسن نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے زخموں کو تازہ کر دیا۔

''جنت......ایک آدھ سال میری یادوں میں روتی رہی ہوگی لیکن میں اُس کی امی کو اچھی طرح جانتا ہوں کوئی نہ کوئی ڈرامہ کر کہ اُنھوں نے اب تک اُس کی شادی کروادی ہوگی''۔

''اور تیری دادی اُن کا تو ٹکٹ کٹ چکا ہوگا اب تک'' آزاد نے دکھ کے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کے لیے جگت ماری۔

''بکواس بند کر میری دادی بوڑھی ضرور ہیں لیکن جب میں آیا تھا تو اُس وقت وہ بھلی چنگی تھیں''۔

''ہاں لیکن انسان کا کوئی پتا چلتا ہے کیا خبر اگلے پل میں کیا ہو جائے'' حسن بھی جگت میں پیچھے رہنے والا نہیں تھا۔

''بند کرو یار اپنی بکواس میں جا رہا ہوں سونے کے لیے'' عمر اُن کی جگتوں سے زچ ہو گیا تھا۔

''مذاق کر رہے ہیں یار برا کیوں مان رہا ہے اور ویسے بھی کل ہمیشہ کے لیے سونا ہی ہے بیٹھ جا کچھ دیر اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں'' عمر اُٹھ کر جانے لگا تو آزاد نے اُسے روک لیا۔

''ٹھیک ہے لیکن اچھی اچھی باتیں کوئی بکواس نہیں'' اُس نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے چل بیٹھ جا'' وہ چاروں پھر سے بیٹھ گئے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

''امریکہ تو ہمارے ملک میں ڈرون حملے دہشتگردوں کو ختم کرنے کی غرض سے کرواتا تھا لیکن اُس نے یہ تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس سے معصوم لوگوں کی بھی جانیں جاتی ہیں، اُنھوں نے تو بس جہاز سے بومب گرانا ہوتا ہے پھر اُس سے دہشتگردوں کے ساتھ چند معصوم لوگ بھی ماریں جائیں تو اُنھیں کیا فرق پڑتا ہے'' میجر صاحب کو بھی اس بات کا رنج تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے ایک ساتھ چار شہروں میں دھماکوں کی کوئی خبر نہیں سُنی گئی اس کا مطلب کہ اُنھوں نے دھماکے نہیں کیے'' میجر صاحب نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی سر اُنھوں نے دھماکے نہیں کیے'' عائشہ گل نے بھی اُن کی حمایت نہیں کی۔

''جس مولانا کی وہ چاروں اتنی مانتے تھے اُس کی حکم عدولی کیسے............''۔

''نہیں سر چاروں نے حکم عدولی نہیں کی تھی'' عائشہ گل نے میجر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو کیا اُن میں سے کسی نے دھماکہ بھی کیا تھا'' میجر صاحب نے جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جی سر'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کس نے''۔

''جمعہ کا دن آ گیا تھا مولانا نے اُن چاروں کو بہت ساری دعائیں دیتے ہوئے روانہ کیا اور ساتھ اُن کو موبائل بھی دے دیئے تاکہ کسی بھی مسئلے کی صورت میں فون کر سکے۔ آزاد حسن اور بلال تو اپنی اپنی جگہ جانے کے لیے نکل گئے لیکن عمر نہیں گیا۔ اُس کا دل ابھی بھی مولانا کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا اُس نے بقیہ کہانی بیان کرتے ہوئے کہا۔

جب وہ مولانا کے کمرے کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کے مولانا کسی سے فون پر بات کر رہے ہیں۔ عمر وہیں کھڑا ہو کر اُن کی باتیں سننے لگا۔

"جی سرکار اب کیا حکم ہے ہمارے لیے......؟" مولانا نے بڑے مودبانہ انداز میں فون کرنے والے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی مجھے آپکا کام یاد ہے آپ فکر نہ کریں میں نے لڑکوں کو بھیج دیا ہے شام تک آپ کو خوشخبری مل جائے گی" مولانا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ ہم پاکستان کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے کیوں کے پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے اور اُس کے پاس دنیا کی بہترین فوج ہے جو ہماری اینٹ سے اینٹ بجا دیگی اس لیے اس ملک کو صرف دہشتگردی سے ہی برباد کیا جا سکتا ہے"۔

"وہ دن دور نہیں جب پورے پاکستان میں ہماری حکومت ہوگی" مولانا کی باتیں سُن کر حیرت کہ مارے اُس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔

"آج شام کو جب چار الگ الگ شہروں میں دھماکہ ہوں گے تو پاکستانی حکومت خود بخود ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی اور پھر ہم مذاکرات میں جو چاہیں اُن سے منوا سکتے ہیں" مولانا نے ایک قہقہ لگایا۔

عمر نے سب کچھ سُن لیا تھا لیکن اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور تیزی سے نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا اور وہاں سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

عمر غار کے پاس پہنچ کر مسلسل بلال کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بم بلاسٹ کرنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے بلال کہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن وہ اُٹھا نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حسن اور آزاد بھی وہاں آ گئے۔

"کیا ہوا عمر تم نے اتنی ہڑبڑاہت میں ہمیں کیوں بلا لیا" حسن نے سوالیہ نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

"یار ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے" اُس نے ہڑبڑاہٹ میں جواب دیا۔

"کیا مطلب" اب سوال کرنے کی باری آزاد کی تھی۔

"مطلب یہ کہ وہ مولانا خود بہت بڑا دہشتگرد ہے اور وہ آج تک ہمارا استعمال کرتا رہا ہے"۔

"تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو" آزاد کو اُس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یار میں نے اپنے کانوں سے اُسے ملک دشمنوں سے ڈیل کرتے ہوئے سنا ہے اور ہماری عقل دیکھو آج ہم خوشی خوشی اُس کہ کہنے پر خود کو جہنم کی طرف لے کر جا رہے تھے''۔

''اللہ کا شکر ہے کے ہمیں وقت پر پتہ چل گیا ورنہ پتا نہیں کتنے انسانوں کی زندگیاں ہماری وجہ سے ختم ہو جاتیں'' آزاد نے اللہ پاک کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم تو جنت کی چاہت میں نکلے تھے لیکن اب دوزخ کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں......'' حسن بھی اپنے کیے پر شرمندہ تھا۔

''کنارے پر نہیں ہم تو دوزخ میں داخل ہو چکے ہیں اس سے پہلے بھی تو ہم کئی انسانوں کی جان لے چکے ہیں پھر بھی تمھیں لگتا ہے کے ہم ابھی بھی دوزخ کے کنارے پر ہیں'' عمر نے غمگین لہجے میں حسن سے کہا۔

''اس کا مطلب کہ ہم نے آج تک جتنے لوگوں کو مارا ہے وہ سب دہشتگرد نہیں تھے بلکہ ان دہشتگردوں کے دشمن تھے'' حسن کے دماغ میں اب بات آئی تھی۔

''ہم لوگ تو پھر بھی بہت بڑا گناہ کرنے سے بچ گئے ہیں لیکن پتا نہیں بلال کے ساتھ کیا ہوا ہوگا'' عمر نے بلال کے بارے میں پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں تم نے اُسے فون نہیں کیا......؟'' حسن نے پوچھا۔

''کافی بار کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ فون اُٹھا ہی نہیں رہا'' عمر نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ ایک دوسرے سے باتیں کر ہی رہے تھے کے اچانک آزاد کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو......کون'' آزاد نے پوچھا۔

''کہاں ہو تم......مقررہ وقت سے بیس منٹ اُوپر ہو چکے ہیں اور تم نے ابھی تک بلاسٹ کیوں نہیں کیا اور وہ باقی دونوں کہاں ہیں'' مولانا نے سخت غصے میں آزاد سے پوچھا۔

''ہم دھماکے نہیں کریں گے ہمیں تمھاری اصلیت کا پتہ چل چکا ہے۔ تم جہاد کے نام پر ہم سے دہشت گردی کروا رہے تھے'' آزاد نے بھی اُسی انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔

''ہم......اس کا مطلب وہ دونوں بھی تمھارے ساتھ ہیں'' مولانا نے پوچھا۔

''ہاں اور کچھ ہی دیر میں بلال بھی یہاں پہنچ جائے گا'' آزاد نے اُسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''ہا ہا ہا......نہیں بلال اب کبھی نہیں آئے گا'' مولانا نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو''......آزاد نے پوچھا۔

کیونکہ بلال نے خود کو بیس منٹ پہلے اُڑا لیا ہے اور اُس بلاسٹ میں اُس کے ساتھ پندرہ لوگ مارے گئے ہیں۔

یہ سُن کر آزاد کے ہاتھ سے فون گر گیا۔

''کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے''۔حسن نے فون گرتا دیکھ کر آزاد سے پوچھا۔

''وہ ب......بلال نے اپنے آپ کو بم سے اُڑا لیا'' اُس نے بمشکل اٹکتے ہوئے کہا۔

یہ خبر سن کر اُنھیں ایسا لگا جیسے کوئی پہاڑ اُن پر گر پڑا ہو۔

☆......☆......☆

سارا دن رونے اور اپنا دل ہلکا کر لینے کے بعد آزاد اور حسن نے توبہ کی آس میں اپنے رب کے حضور رجوع کیا اور اپنے گناہوں کی توبہ کرنے لگے۔لیکن عمر اپنے آپ کو توبہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔وہ وہیں بیٹھ کر روتا رہا اور روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی اور پھر ہر طرف نور ہی نور چھا گیا ایک حسین سے چہرے والے بزرگ اُس کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔

''کون ہیں آپ'' عمر سے پوچھے بنا نہ رہا گیا۔

''میں کون ہوں یہ بات معنی نہیں رکھتی لیکن یہ بتاؤ کے تمھارے دوست کب سے توبہ میں مصروف ہیں لیکن تم اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی کیوں نہیں مانگتے'' بزرگ ہستی نے عمر سے پوچھا۔

''اگر آپ کو پتا ہوتا کہ میں نے کیا کیا ہے تو آپ کبھی مجھ سے یہ بات نہیں پوچھتے'' عمر نے کہا۔

''تمھارے دوستوں نے بھی تو وہی گناہ کیا ہے لیکن وہ تو توبہ میں مصروف ہیں''۔

''لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ اتنا بڑا گناہ کرنے کہ بعد بھی اللہ کہ سامنے جاؤں'' عمر نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

’’کتنا ہی بڑا گُناہ کیوں نہ ہو لیکن اُس پروردگار کی رحمت سے بڑا نہیں اس لیے سچے دل سے توبہ کرو انشا اللہ تمھارے سب گُناہ معاف ہو جائیں گے‘‘۔

’’کیا اللہ معاف کر دے گا‘‘ اُس نے معصومیت بھرے لہجے میں کیا۔

’’تمھیں کیا لگتا ہے اگر تم اپنی ماں سے کوئی چیز مانگو گے تو کیا وہ انکار کر دے گی‘‘ اب سوال کرنے کی باری بزرگ کی تھی۔

’’نہیں ایک ماں تو اپنے بچے سے اتنا پیار کرتی ہے کے کبھی کسی چیز کے لیے انکار نہیں کرتی‘‘۔

’’تو پھر تمھیں کیا لگتا ہے جو پروردگار اپنے بندوں سے ستر 70 ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے وہ تمھیں معاف نہیں کریگا‘‘۔

’’کیا اللہ نے بلال کو بھی معاف کر دیا ہوگا‘‘ عمر نے پوچھا۔

’’یہ اُس کا اور اُس کے رب کا معاملہ ہے، تم اپنے گناہوں کی معافی مانگو اگر سچے دل سے توبہ کرو گے تو پروردگار تمھیں ضرور معاف کر دے گا‘‘ بزرگ کا یہ کہنا ہی تھا کہ عمر کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے اردگرد نظر اُٹھا کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ پھر عمر نے وضو کیا اور اپنے رب کے حضور سچے دل اور نم آنکھوں سے توبہ کرنے کے لیے پیش ہوا اور صبح ہونے تک اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

☆......☆......☆

’’بیچارہ بلال مولانا کی باتوں میں آکر اپنی زندگی بھی ضائع کی اور اپنے ساتھ اتنے سارے لوگوں کی بھی ‘‘میجر صاحب کو اُس پر ترس آرہا تھا۔

’’وہ مولانا کے جھوٹے دکھلاوے سے اس قدر متاثر تھے کہ اب تو وہ مولانا پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور لوگوں کی جانیں لے لے کر تو اُنھیں اپنی زندگی سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا یہ پتا نہیں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت تھی کہ یہ تینوں بچ گئے‘‘۔

’’پتا نہیں ہمارے معاشرے کو کیا ہو گیا ہے پہلے یہ سُنا کرتے تھے کہ ہمارے سادہ لوح لوگوں نے کسی جعلی پیر کی باتوں میں آکر کسی جانور کی بلی چڑھا دی اور آج یہ سن رہے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں نے جعلی مولانا کے

چکروں میں آ کر پتا نہیں کتنے معصوم انسانوں کی بلی چڑھا دی‘‘ میجر صاحب کا خون کھول رہا تھا۔

’’بی بی آپ نے تو کہا تھا کہ آپ مجھے جن دہشتگردوں کی کہانی سنانا چاہتی ہیں اُن میں سے ایک آپ کا بھائی ہے اور ایک آپ کا شوہر لیکن اس کہانی میں تو آپ کا کہیں ذکر ہی نہیں‘‘۔

’’سر ابھی کہانی ختم ہی کہاں ہوئی ہے بلکہ یوں کہیے کہ ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے......‘‘۔

’’کیا مطلب......‘‘۔

’’مطلب یہ کہ سر اب اُن لوگوں پر مولانا کی اصلیت کُھل چکی تھی اور وہ اپنے گناہوں کی توبہ بھی کر چکے تھے لیکن قانون کی نظروں میں وہ اب بھی دہشتگرد ہی تھے اور اس وقت جو اُنھیں سب سے بڑی پریشانی تھی وہ یہی تھی کہ اب آگے کیا کرنا ہے‘‘۔

☆......☆......☆

’’اب کیا کریں گے ہم اس وقت وہ مولانا ہمارے خون کا پیاسا ہوگا اور یقیناً اُس نے اپنے کُتے ہمارے پیچھے لگائے ہونگے اور ہماری بدقسمتی دیکھو کہ ہم لوگ پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتے کیونکہ پولیس ہمیں پکڑ لے گی اور جیل میں کر دے گی‘‘ حسن نے غصے میں پتھر پہ ہاتھ دے مارا۔

’’ٹھیک کہہ رہے ہو تم حسن ہم یہاں پر بھی زیادہ دیر نہیں رہ سکتے کیونکہ اگر یہاں رہے تو یہ مولانا ہمیں مروا دے گا‘‘ آزاد نے بھی اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

’’جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ کچھ ایسا کام کریں جس سے ہم اپنے سارے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں‘‘ عمر جو اب تک سوچوں میں گم تھا اچانک کچھ سوچ کر بولا۔

’’مطلب کیا ہے تمھارا......؟‘‘ حسن اُس کی بات سُن کر چونک گیا تھا۔

’’تمھیں یاد ہے جب ہم اکبر کہ کیمپ میں گئے تھے تو وہاں کم از کم دو سو لڑکے تھے ہم صرف چار تھے تو کم و بیش ستر لوگوں کو مار چکے ہیں اور اگر وہ دو سو لڑکے دس دس انسانوں کو بھی ماریں تو پورے ملک میں کہرام مچ جائے گا اس لیے اگر ہم اپنے جیسے دوسرے لڑکوں کو یہاں سے آزاد کروا دیں تو شائد ہم نے جو کچھ کیا ہے اُس کی تلافی ہو جائے‘‘ عمر نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو یار عمر لیکن ہم یہ کریں گے کیسے''۔

''ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ اکبر کا کیمپ کہاں ہے تمھیں یاد نہیں وہ جابر ہمیں پٹی باندھ کر لے کہ گیا تھا'' آزاد نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

''پٹی ہماری آنکھوں پر تھی لیکن جابر کی آنکھوں پر تو نہیں''۔

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ جابر تمھیں وہاں لے کر جائے گا'' حسن نے سوالیہ نگاہوں سے۔

''ہو ہی نہیں سکتا یار وہ مولانا کا خاص آدمی ہے وہ کیوں ہمیں اُس کا ٹھکانہ بتائے گا اور ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے'' آزاد کی بات نے سب کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

''چلو فرض کرو کہ ہم جابر کو پکڑ لیتے ہیں اور وہ ہمیں کیمپ کا پتا بھی بتا دیتا ہے اور ہم وہاں پہنچ بھی جاتے ہیں تو پھر بھی ہم اُن لڑکوں کو اُس کی قید سے رہائی کیسے دلوائیں گے'' حسن اپنے دماغ میں آنے والے سارے سوال داغ رہا تھا۔

''اسکے لیے ہمیں اُس مولانا کا اصلی چہرہ اُن سب لڑکوں کے سامنے لانا ہوگا''۔

''لیکن اُس کے پاس بہت سارے آدمی اور ہتھیار ہیں اور ہمارے پاس صرف یہ تین خودکش مواد سے بھری جیکٹیں'' آزاد نے عمر کو خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

''وہ سب بعد میں دیکھیں گے فی الحال تم ایک کام کرو مولانا کو فون کرو اور کال ریکارڈنگ پر لگا دو'' آزاد نے جلدی جلدی سے مولانا کا نمبر ملایا اور کال ریکارڈنگ پر لگا کر موبائل عمر کو پکڑا دیا۔

''اسلام وعلیکم'' دوسری طرف سے فون اُٹھانے والے نے کہا جو یقیناً مولانا ہی تھا۔

''کل تک تو ہمیں مارنے کی بات کر رہے تھے اور آج ہم پر سلامتی بھیج رہے ہو'' عمر نے مولانا کو طنز کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم لوگ ......تمھاری قسمت اچھی ہے کے میرے ہاتھ نہیں آئے ورنہ اب تک مارے جا چکے ہوتے'' مولانا کو اُس کا یہ طنز پسند نہیں آیا تھا۔

''زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور شاید پروردگار نے ہمیں زندہ اسی لیے رکھا ہے تاکہ ہم

تیری موت کی وجہ بن سکیں‘‘۔

’’بیوقوف ہو تم لوگ اگر تم دھماکہ کر دیتے تو ایک منٹ میں تمھاری جان نکل جاتی لیکن اب تم لوگ کتے کی موت مرو گے میں ماروں گا تم لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے‘‘ مولانا غصے سے تپ رہا تھا۔

’’تیرا منصوبہ تو بہت اچھا تھا لیکن افسوس نا کام ہو گیا‘‘۔

’’یہ تم لوگوں کی بھول ہے میرے منصوبے کی تم فکر مت کرو میرے پاس اور بھی بہت سارے نوجوان ہیں جو میرے ایک اشارے پر اس ملک کو آگ کا دریا بنا سکتے ہیں فکر تو تم لوگوں کو اپنی کرنی چاہیے کیونکہ میں اب تمھارے جسم سے بوٹی بوٹی نوچ لوں گا‘‘ مولانا اپنا سارہ غصہ عمر پر نکال رہا تھا۔

’’کیا تم اُن نوجوانوں کو بیوقوف سمجھتے ہو جو تمھاری باتوں میں آجائیں گے‘‘ عمر مولانا کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا تا کے مولانا کوئی ایسی بات کر دے جس سے اُس کا سارہ راز فاش ہو جائے۔

’’ہاں بیوقوف ہیں وہ لوگ بھی اور تم بھی اگر بیوقوف نہ ہوتے تو جہاد کے نام پر گمراہ نہ ہوتے اور میرے جھانسے میں نہ آتے‘‘ مولانا جو ابھی تک غصے میں تھا اچانک قہقہے لگانے لگا۔

’’بہت جلد تیری یہ ہسی موت کے سناٹے میں بدل جائے گی‘‘۔

’’بے شک بہت جلد موت کا سناٹا چھانے والا ہے لیکن وہ میری نہیں تمھاری موت کا سناٹا ہو گا کیونکہ میں نے چاروں طرف اپنے آدمیوں کو لگا دیا ہے اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمھاری گردنیں میرے قدموں تلے ہوں گی‘‘ اس کے ساتھ ہی عمر نے فون بند کر دیا اور ریکارڈ کی ہوئی کال کو سننے لگا۔

’’تم لوگ پوچھ رہے تھے نہ کے ہم مولانا کا مقابلہ کیسے کریں گے تو سب سے پہلے ہمیں اُن لڑکوں کو سیدھے راستے پر لانا ہو گا اور اُنھیں یہ بتانا ہو گا کے وہ جنت کی چاہت میں خود کو دوزخ کی طرف لے جا رہے ہیں‘‘ عمر کی باتوں کی سمجھ اب اُن دونوں کو آ گئی تھی۔

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کے کچھ لوگوں نے اُنھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

☆......☆......☆

پچھلے دو گھنٹوں سے پیدل چلتے چلتے وہ سب بے حال ہو چکے تھے اُن کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے

تھے۔ چلتے چلتے حسن کو چکر آ گیا اور وہ نیچے گر گیا ایک شخص بھاگ کر آگے آیا جس کا نام خدا بخش تھا اُس نے حسن کو اُٹھایا اور پانی پلایا۔ آزاد اور عمر اُس کی یہ رحم دلی دیکھ کر حیران ہوئے۔

''کیا تم لوگوں نے بھی پانی پینا ہے......'' خدا بخش نے پانی کی مشق اُن دونوں کی طرف بڑھائی۔

اُن دونوں نے ہاں میں اپنی گردن ہلائی تو خدا بخش نے اُن دونوں کو بھی پانی پلایا۔

''کہاں لے کر جا رہے ہو تم لوگ ہمیں......'' آزاد نے خدا بخش سے پوچھا۔

''بس اور کچھ دیر انتظار کرو پھر تمھیں سب کچھ پتا چل جائے گا''۔

آدھے گھنٹے کی مزید مسافت طے کرنے کے بعد وہ سب ایک بستی کے قریب پہنچے جہاں ہر طرف کچے مکان تھے چھوٹے چھوٹے بچے گلی میں کھیل رہے تھے، اس جگہ کا نقشہ بھی اُس جگہ سے ملتا تھا جہاں وہ پہلے گئے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے کے قریب آ کر خدا بخش رُک گیا اُس نے کمرے کا تالا کھولا اور ایک شمع روشن کی اور اُن تینوں کو ایک ہی رسی سے باندھ دیا۔

ابھی تم لوگ یہیں رہو شام کو ہمارے سردار آئیں گے تو وہی فیصلہ کریں گے کہ تمھارا کیا کرنا ہے'' خدا بخش نے باہر سے دروازے کو تالا لگایا اور وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

''خدا بخش کون ہیں یہ لوگ اور تم نے انھیں اس طرح باندھ کیوں رکھا ہے'' رات کو گیارہ بجے کے قریب خدا بخش نے اُن کو اپنے قبیلے کے سردار محمد عبدالرحمٰن کے سامنے پیش کیا۔

''سردار یہ لوگ دہشتگرد ہیں پہاڑوں پر بیٹھ کر دھماکہ کا منصوبہ بنا رہے تھے'' خدا بخش کو جو سمجھ آیا اُس نے اُس کے مطابق بیان کر دیا۔

''ہمارے ہاتھ کھولو......ہم لوگ دہشتگرد نہیں ہیں''۔

''تمھارے ہاتھ کھول دیں تاکہ تم اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اُڑا دو......تم جیسے خطرناک دہشتگردوں کو آزاد کر کہ ہم اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتے'' خدا بخش نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''میں کتنی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ ہم دہشتگرد نہیں ہیں'' عمر نے بھی اُسی انداز میں جواب دیا

''تو پھر یہ خودکش مواد سے بھری جیکٹیں تمھارے پاس کیا کر رہی ہیں''عبدالرحمٰن نے اُن سے تحقیقات کرتے ہوئے پوچھا۔

''آزاد نے بھی وقت ضائع کیے بغیر جواباً خود پر گزری ہوئی ساری روداد سنادی''۔

''حیرت ہوتی ہے کہ تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان بھی ایسے جاہلوں کی باتوں میں آگئے اور کتنے معصوم انسانوں کو اُس کے کہنے پر قتل کر دیا''۔

''بھائی کی موت کی وجہ سے ہم اپنے حواس کھو بیٹھے تھے اور پھر بدلہ کی آگ نے ہمیں اندھا کر دیا تھا اسی بات کا مولانا نے فائدہ اٹھایا''آزاد نے مارے شرم کے جھکے سر جواب دیا۔

''تم لوگ یہ بھی بھول گئے کے جہاد اسلام کے دشمنوں کے خلاف کیا جاتا ہے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو قتل کرنا جہاد نہیں دہشتگردی کہلاتی ہے' ہمارے پیارے نبی حضرت محمدﷺ نے تو حالت جنگ میں بھی بچے بوڑھے اور عورتوں پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے اور تم لوگ یہ جو کچھ کرتے رہے ہو جانتے ہو اس میں کتنے بے گناہ لوگ مارے گئے' دل تو چاہتا ہے کے ابھی اپنی بندوق کی ساری گولیاں تمھارے سینے میں اُتار دوں''عبدالرحمٰن نے غصے سے اپنی بندوق ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم لوگ توبہ کر چکے ہو اس لیئے اب یہ تمھارا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اگر تم واپس جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو''اُس نے خدا بخش کو اُن کے ہاتھ کھولنے کے لیے اشارہ کیا۔

''نہیں اب ہم واپس نہیں جانا چاہتے''وہ تینوں بدستور سر جھکائے ہوئے تھے۔

''تو پھر تم کیا چاہتے ہو''۔

''ہم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہم اپنی غلطیوں کا ہرجانہ ادا کرنا چاہتے ہیں''۔

''کیا مطلب''......عبدالرحمٰن نے حیرت سے آزاد کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ ہمارے جیسے اور بھی بہت سارے نوجوان ایسے ہیں جو اُس غدار کے کہنے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں اس لیے ہم اُنھیں بھی اُس کی قید سے آزاد کروانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے''۔

’’کیا تم لوگ اُس کا ٹھکانہ جانتے ہو‘‘۔
’’نہیں لیکن ہم ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جو اُس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے‘‘ ہاتھ کھلے ہی اُن تینوں نے وہ جیکٹیں اُتار دی اور خدا بخش کے حوالے کر دیں۔

☆......☆......☆

’’تو کیا سوچا ہے تم لوگوں نے ہمیں کہاں سے شروعات کرنی چاہیے‘‘ عبدالرحمٰن نے پوچھا۔
وہیں سے جہاں یہ کہانی شروع ہوئی تھی آزاد نے کہا۔
’’کیا مطلب......؟‘‘ عبدالرحمٰن نے سوالیہ نگاہوں سے اُنکی طرف دیکھا۔
’’سب سے پہلے ہمیں جابر کو ڈھونڈنا ہوگا کیونکہ جب تک وہ ہمیں نہیں ملتا ہم کچھ نہیں کر سکتے‘‘۔
’’جو خلیہ تم نے مجھے بتایا تھا مجھے میرے جاننے والوں سے خبر ملی ہے کہ اُسی طرح کا ایک آدمی لاہور میں ہے اور وہ بھی اسی طرح نو جوانوں کو جہاد کی دعوت دیتا ہے اگر تم چاہو تو لاہور جا کر اُس کی شناحت کر سکتے ہو‘‘۔
’’لاہور......‘‘ اپنے شہر کا نام سنتے ہی اُس کے ذہن میں تمام پرانی یادیں ایک فلم کی طرح گھومنے لگی تھی۔
’’لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ شخص کوئی اور ہو‘‘ آزاد نے اندازہ لگاتا ہوئے کہا۔
’’لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ جابر ہی ہو‘‘ حسن نے بھی اندیشہ ظاہر کیا۔
’’یہاں اندازے لگانے سے بہتر ہے کہ وہاں جا کر ہی دیکھ لیا جائے‘‘ عمر نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔
’’لیکن ہم تینوں کا ایک ساتھ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا اس لیے میرے خیال سے ہم میں سے کسی ایک کو وہاں جانا چاہیے‘‘ آزاد نے مشورہ دیا۔
’’ٹھیک ہے میں جاؤں گا‘‘ عمر نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا۔
’’میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا‘‘ حسن اُسے اکیلے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔
’’نہیں حسن آزاد ٹھیک کہہ رہا ہے ہمارا ایک ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا‘‘۔
’’لیکن میں تمھیں اکیلا نہیں جانے دے سکتا‘‘۔
’’فکر مت کرو خدا بخش بھی عمر کہ ساتھ ہی جائے گا‘‘ اُس نے بظاہر تو جابر کی تلاش میں جانے کہ لیے خامی

بھر لی لیکن اُس کے دماغ میں کچھ اور ہی تھا۔

☆......☆......☆

''میں تم سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں صرف ایک بار تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں کے تم آج بھی میری محبت کی یادیں دل میں بسائے میرا انتظار کر رہی ہو یا پھر تم سب کچھ بھول کر اپنی زندگی کا آغاز نئے سرے سے کر چکی ہو۔ پتا نہیں تم مجھے دیکھ کر کیا ردِ عمل ظاہر کرو گی خوش ہو گی یا ناراض جانتا ہوں کے تمھارا دل مجھ سے بہت سے سوالوں کا جواب مانگ رہا ہو گا میں نے جو تمھارے ساتھ کیا اس کے بعد تو میں معافی کا بھی حقدار نہیں ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا کے جو خواب ہم دونوں نے دیکھے تھے میں یوں اکیلے ہی اُن سب کو توڑ کر چلا آیا ایک بار بھی تمھارے بارے میں نہیں سوچا کے تم پر میرے جانے کے بعد کیا گزرے ہو گی'' عمر جنت کو تصور میں سوچ کر اپنے دل کی باتوں کا اظہار کر رہا تھا۔

عمر لاہور کے چپے چپے سے واقف تھا یہ وہی شہر ہے جہاں اُس نے اپنی زندگی کے چوبیس سال گزارے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد دس بجے کے قریب عمر گھر سے باہر آیا وہ ہر گھر کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید کہیں اُسے وہ چہرہ نظر آ جائے جس کے دیدار کے لیئے کب سے اُس کی آنکھیں بے چین بھٹک رہی ہیں۔ وہ چلتا چلتا کافی دور نکل آیا تھا چلتے چلتے یہ احساس ہی نہیں ہوا کے کب صبح سے دوپہر ہو چکی تھی۔ صبح سے آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے جس وجہ سے وقت کے گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

مولوی عبدالرحمٰن نے اُنھیں سختی سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کن سوچوں کے بھنور میں گم وہ سب حکم نظر انداز کر کے اُس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اتنی دیر چلتے چلتے عمر کافی تھک چکا تھا اور بھوک بھی ستانے لگی تھی جب بھوک کی شدت میں مزید اضافہ ہوا تو عمر نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیئے ایک ریسٹورنٹ کا رُخ کیا۔ ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد جب اُس کی نظر سامنے والے ٹیبل پر پڑی تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اُس کے سامنے وہی ہستی تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیئے صبح سے اُس کی آنکھیں اور دل مچل رہے تھے اور اب جب وہ سامنے تھی تو اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کے جا کر اُس سے بات کر سکے۔

وہ آج بھی اتنی ہی پُرکشش اور دلفریب تھی جتنی وہ پہلے تھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

عمر کی نظریں مسلسل اُسی پر جمی ہوئی تھی پچھلے دس منٹ سے وہ مسلسل اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اُسے تو اس بات کا بھی ہوش نہیں رہا کے ویٹر کھانا رکھ کر جا چکا ہے۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اسد کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسد نے فون ریسیو کیا اور فون پر اپنے کلائنٹ سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ جنت نے ایک نظر اپنے اردگرد کے ماحول پر ڈالی جیسے ہی جنت کی نظریں اپنے سامنے والے ٹیبل پر بیٹھے شخص پر پڑی تو وہ اُسے اک چبھن سی محسوس ہوئی۔

وہ عمر تھا سفید شرٹ اور بلیو جینز میں ملبوس وہ اُس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اُس کے چہرے کے تاثرات اور بڑھی ہوئی داڑھی سے لگ رہا تھا کے وہ وقت اور حالات سے کافی تھک چکا ہے۔ وہ دونوں اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جا رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کر رہے ہوں۔ وہ دونوں اُس وقت ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دنیا کی ہر شے تھم سی گئی ہو نہ کوئی حرکت نہ کوئی بات اور شاید وہ دونوں پوری زندگی ایسے ہی بیٹھے رہتے اگر جنت اسد کے زور سے قہقہ لگانے کی آواز سے چونک نہ جاتی۔

اب جنت نے دوبارہ سامنے والے ٹیبل کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا اُس نے حیرانگی سے گردونواح پر نظر ڈالی تو اُسے ایک ہجوم میں بھی وہ نظر نہ آیا جس کو اُس کی نظریں تلاش کر رہی تھی۔ ویٹر نے کھانا ٹیبل پر رکھا تو اسد نے موبائل پر الوداعی کلمات ادا کیئے اور کھانا کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔

جنت کی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو لیکن صرف اسد کی خاطر اُس نے بھی کھانا شروع کیا۔ بظاہر وہ دونوں کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے لیکن جنت کے دماغ میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کے ابھی اُس نے عمر کو دیکھا یا پھر اُس کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

''کہاں گئے تھے تم میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا تھا'' جیسے ہی عمر کمرے میں داخل ہوا خدا بخش نے شکایتی انداز میں کہا۔

''ایک ضروری کام سے گیا تھا'' عمر نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

''سردار نے ہمیں سختی سے باہر جانے سے منع کیا تھا'' خدا بخش نے اُسے یاددہانی کروائی۔
''تم فکر مت کرو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کونسی جگہ خطرہ ہے اور کونسی جگہ محفوظ ہے'' عمر نے خدا بخش کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے آج رات تیار رہنا ریحان ہمیں اُس شخص کہ ٹھکانے پر لے کر جائے گا''۔
''ریحان کون......؟''۔
''ریحان سردار کے قریبی دوست کا بیٹا ہے وہ لاہور میں ٹیکسی چلاتا ہے اور اُسی نے ہمیں جابر کے بارے میں اطلاع دی تھی، رات کو وہ ہمیں لینے آجائے گا تب تک یہیں انتظار کرتے ہیں''۔
''ٹھیک ہے'' عمر آج بہت پرسکون لگ رہا تھا کیوں کے آج جنت کو خوش دیکھ کر اُس کے دل سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کے جنت آج بھی اُس کی یاد میں رورو کر خود کو حلقان کرتی ہوگی اور مجھے کوستی ہوگی کے میں کیوں اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن آج جنت کو اسد کے ساتھ خوش دیکھ کر اُس کی ساری پریشانیاں ختم ہوگئیں تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کے جنت اُسے دیکھے کیونکہ پھر اُس کے لیئے جنت کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہو جاتا اس لیئے جیسے ہی جنت کا دھیان دوسری طرف ہوا عمر بڑی چالاکی سے نظر بچا کر وہاں سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

جنت نے جب سے عمر کو دیکھا تھا وہ ایک اُلجھن کا شکار تھی اسد اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر یہ سمجھ رہا تھا کے شاید وہ تھک گئی ہے اس لیے وہ دونوں گھر واپس آگئے۔
جنت گھر آتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی ریسٹورنٹ سے واپسی کے سفر میں بھی وہ مسلسل خاموش تھی۔ کمرے میں ہر طرف جگمگاتا اُجالا تھا لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر طرف گھُپ اندھیرا ہو۔ آج عمر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی زہر آلود تیر اُس کے دل کے آرپار ہوگیا ہو۔ ماضی کی جن تلخ یادوں کو وہ دل کے کسی کونے میں دفن کر چکی تھی وہ اُس بے وفا کو دیکھتے ہی پھر سے اُس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں تھیں۔
''کیا واقعی وہ میرا وہم تھا نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے کے میں عمر کو پہچان نہ سکوں میں تو اُسے ہزاروں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی پہچان سکتی ہوں......لیکن وہ عمر کیسے ہوسکتا ہے عمر تو مر چکا ہے'' جنت کا دل گواہی دے رہا تھا کے

وہ عمر تھا لیکن اُس کا دماغ دل کے برعکس جواب دے رہا تھا۔

اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کے دل پر یقین کرے یا دماغ کی بات سُنے جب کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو وہ تھک ہار کر بستر پر ڈھے گئی اور اپنی آنکھیں بندھ کر لی لیکن نیند تو جیسے اُس سے روٹھی ہوئی تھی۔آدھا گھنٹہ بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب نیند نہ آئی تو جنت بستر سے اُٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

جنت نے اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے اپنی اور آسمان کی حالت بالکل ایک جیسی لگی۔آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے شام ہونے میں کافی وقت تھا لیکن آسمان پر کہیں بھی سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ کالے بادلوں کے اندھیرے سے رات کا وقت لگ رہا تھا۔پھر اچانک تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔

بارش کی شوخ بوچھاڑیں کھڑکی کے زریعے کمرے کے اندر کھڑی جنت کو بھی بھگو رہی تھیں۔جنت جو پہلے سے ہی اُداس تھی بارش کو دیکھ کر اور بوجھل سی ہوگئی اُسے وہ بارش یاد آگئی جس میں عمر نے اُس سے پہلی بار اپنی محبت کا صاف لفظوں میں اظہار کیا تھا۔اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رُکنے والا سیلاب بہنے لگا۔

☆......☆......☆

”تم واپس کیوں نہیں آئے عمر تم نے وعدہ کیا تھا کے میں جلد واپس لوٹ آؤں گا لیکن تم جو ایک بار یہاں سے گئے تو ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کے تمھارے بغیر میرا کیا ہوگا“ جنت روتے روتے عمر سے شکوے کر رہی تھی۔

”ہم دونوں نے اپنے سنہرے مستقبل کے بارے میں کیا کیا سوچا تھا کتنے خواب دیکھے تھے لیکن تم نے سارے خواب چکنا چور کر دیئے ایسی بھی کیا چاہت تھی تمھیں دولت کی کے تم نے اُس کے لیئے اپنے ماں باپ اپنی بہن اور یہاں تک کے مجھے بھی چھوڑ دیا۔اگر ایسے ہی چھوڑ کر جانا تھا تو پھر تم میری زندگی میں آئے ہی کیوں......کیوں تم نے مجھے بے وفائی کا ایسا زخم دیا جس کا علاج دُنیا کے کسی بھی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں اور اب ساری زندگی مجھے یہ زخم ناصور بن کر تڑپاتا رہے گا“ جنت آج اپنی ساری بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔

”میں تو ساری زندگی تمھارا انتظار کر سکتی تھی لیکن میرے اردگرد گھیرا تنگ کر دیا گیا میرے انکار کے باوجود

امی مجھے اسد سے شادی کرنے کے لیئے منانے کی کوشش کرتیں ممانی بھی بار بار رشتے کی غرض سے آتی اور رہی سہی کسر بڑی امی کی اداکاری نے کردی اُنھوں نے مجھے منانے کے لیے اتنی خوب اداکاری کی کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی شادی کے لیئے ہاں کرنی پڑی" جنت اب اپنی صفائیاں پیش کرنے میں لگی تھی۔

"تم تو مر چکے تھے پھر کیوں آج جب میں سب کچھ بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنے جا رہی تھی تو تم پھر سے پرانے زخم تازہ کرنے آ گئے" اچانک کہیں دور بجلی کے زوردار گرجنے کی آواز اُس کہ کانوں میں پڑی تو اُس کے خواس بحال ہوئے اُس کے سامنے کوئی نہیں تھا اور اتنی دیر سے خود سے ہی باتیں کر رہی تھی۔

ایک بار پھر جنت کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہنا شروع ہو گئی آہستہ آہستہ کمرے کی ہر چیز دھندلی ہونے لگی اور پھر ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

☆......☆......☆

"رات کو آٹھ بجے عمر اور خدا بخش جابر کے گھر کے سامنے پہنچ کر اُس کا انتظار کر رہے تھے" اُن دونوں نے اپنے منہ کو کپڑے سے چھپایا ہوا تھا۔

"یار اتنی دیر ہو گئی یہ جابر ابھی تک آیا کیوں نہیں" خدا بخش انتظار کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

"گیا ہو گا اپنے مولانا کے لیئے کوئی نیا شکار تلاش کرنے تا کے وہ مولانا پھر معصوم لڑکوں کو قربانی کا بکرا بنا کر اُن سے دہشتگردی کروا سکے لیکن اُسے کیا خبر کے آج وہ خود شکار ہونے والا ہے"۔

"وہ دیکھو آ رہا ہے تمھارا شکار" ریحان نے دور سے آتے ہوئے جابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی ہے وہ سانپ جس نے ہماری زندگیوں میں زہر گھولا تھا" عمر نے اپنی بندوق پر سائیلنسر لگایا تا کے کسی کو بھی گولی کی آواز سُنائی نہ دے۔

فاروق نے جیسے ہی دروازہ کھولا خدا بخش نے اُسے پیچھے سے اندر کی طرف دھکیل دیا۔ جابر منہ کے بل زمین پر جا گرا اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں اپنی پستولوں کا رُخ اُس کی طرف کیئے کھڑے تھے وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا گیا۔

"کون ہو تم......؟" اُس نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے پوچھا۔

’’پہچانا نہیں......‘‘ عمر نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے کہا۔

’’ت......تم......تم یہاں کیسے......؟‘‘ عمر کو دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے یہ تو جانتا تھا کے وہ لوگ وہاں سے بھاگ چکے ہیں لیکن جابر نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کے عمر یہاں پہنچ جائے گا۔

’’تمھاری موت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے ہماری زندگی برباد کر کے تمھیں سکون نہیں ملا جو اور نوجوانوں کی زندگیاں برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو‘ تمھاری وجہ سے ہم نے انجانے میں پتہ نہیں کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا‘ تم نے جہاد کے نام پر ہمیں اُکسایا اور اُس مولانا نے ہمیں دہشتگردی کی طرف مائل کر کے ہمارے ہاتھ معصوم لوگوں کے خون سے رنگ دیئے لیکن اب نہ تو تم کسی معصوم انسان کی زندگی سے کھیل سکو گے اور نہ تمھارا مولانا کسی اور نوجوان کو دہشتگرد بنا سکے گا کیوں کے اب تم ایسا کرنے کے لیئے زندہ نہیں رہو گے‘‘۔

’’دیکھو میں نے جو کچھ بھی کیا اُس مولانا کہ کہنے پر کیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے‘‘۔

’’اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا جواب دو ورنہ......‘‘۔

’’نہیں خدا کے لیئے گولی مت چلانا میں تمھارے سارے سوالوں کے جواب دوں گا‘‘۔

’’کراچی ریلوے سٹیشن پر جو بم دھماکہ ہوا تھا وہ کس نے کیا تھا؟‘‘۔

’’وہ ایک دہشتگرد نے کیا تھا مجھے جب اُس شخص کا پتا چلا تو میں نے آزاد کو اُس کے بارے میں بتایا تھا تم چاہو تو آزاد سے پوچھ سکتے ہو‘‘ اُس نے صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

عمر نے کوئی بات کرنے کی بجائے اُس کی ٹانگ میں گولی مار دی۔ سائیلینسر کی وجہ سے گولی کی آواز بالکل بھی نہیں آئی صرف جابر کے تڑپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اُسے بھی خدا بخش نے تیزی سے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر بندھ کر دیا تھا۔

’’اگر دوبارہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو دوسری گولی تمھارے سر میں ماروں گا‘‘۔

’’وہ دھماکہ کس نے کروایا تھا؟‘‘ اُس نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔

’’مولانا کہ کہنے پر میں نے ہی بم رکھوایا تھا تا کہ تم کو اپنے جال میں پھنسا سکوں‘‘ اُس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

''جن جن لوگوں کو ہم نے مارا کیا وہ واقعی ملک کے دشمن تھے؟'' اب اُس نے اپنا دوسرا سوال داغ دیا۔

''نہیں وہ سب مولانا کے دشمن تھے''۔

''اکبر کا وہ کیمپ کہاں ہے جہاں وہ لڑکوں کو ہتھیار چلانا سکھاتا ہے''

''وہ ہر سال اپنے کیمپ کی جگہ بدلتا ہے اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ملے گا'' عمر کو اس جواب کی بالکل بھی توقع نہیں تھی اُس نے دوسری ٹانگ میں بھی گولی ماردی۔

''خوش قسمت ہو جو تمھیں ایک موقع اور مل گیا ورنہ واقعی یہ گولی تمھارے سر کے آر پار ہوتی''۔

''اُس کا کیمپ سوات میں ہے جب تم مین اڈے پر پہنچو گے تو وہاں سے ایک بس ملے گی جو تمھیں راستے میں ایک کچے راستے کے پاس اُتارے گی وہاں سے نیچے کو راستہ جاتا ہے آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد تم وہاں پہنچ جاؤ گے..........مل گئے تمھیں اپنے سوالوں کے جواب اب دفعہ ہو جاؤ یہاں سے'' اُس نے درد سے بلکتے ہوئے کہا۔

''ایک آخری سوال ابھی باقی ہے...... ہماری زندگیاں برباد کر کے کیا ملا تجھے''۔

اس سوال کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا عمر نے بھی بغیر کوئی انتظار کیے اپنی بندوق کا سارا لوہا اُس کے سینے میں اُتار دیا۔

☆......☆......☆

ساری رات برسنے کے بعد بارش تھم چکی تھی اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔ سورج کی روشنی سے درختوں کے پتوں پر ٹھہرے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اندر تک آ رہی تھی۔

''جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلی تو اسد اُس کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ ہڑبڑاہٹ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی''۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمھیں ہوش آ گیا کل رات جب میں آفس سے آیا تو تم کھڑکی کہ پاس بے ہوش پڑی ہوئی تھی''۔

''کیا ہوا تھا مجھے'' جیسے اُسے تو کچھ یاد ہی نہ ہو۔

’’کمال کرتی ہو تم بھی جنت تمھیں اتنا تیز بخار تھا اور تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں‘‘۔

’’مجھے......بخار......‘‘ اُس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

’’اچھا ابھی فوراً اُٹھو ناشتہ کرو اور یہ دوا کھالو پھر مجھے آفس بھی جانا ہے‘‘ اُس نے دوا جنت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’آپ کو آفس کے لیے دیر ہو رہی ہو گی آپ جائیے میں دوا لے لوں گی‘‘۔

’’ٹھیک ہے تم ابھی یہ دوا کھالو پھر شام کو میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا‘‘ اسد نے دوا اُس کی طرف بڑھائی۔

’’ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں‘‘۔

’’Are you sure .....?‘‘۔

’’آپ فکر نہ کریں میں اب بالکل ٹھیک ہوں‘‘ اُس نے ایک بار پھر سے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں اپنا خیال رکھنا‘‘ وہ الوداعی کلمات ادا کر کے چلا گیا۔

جنت جیسے ہی اپنے بستر سے اُٹھنے لگی تو اُس کے موبائل کی گھنٹی بجی، موبائل کی سکرین پر اجنبی نمبر دیکھ کر وہ چونک گئی اُس نے جلدی سے فون آن کیا اور اپنے کان سے لگایا۔

’’جنت‘‘ دوسری طرف سے آنے والی آواز سُن کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔

’’ک......کون‘‘ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

’’جنت......میں......عمر‘‘

’’یہ کیسے ہو سکتا ہے......تم تو......‘‘ اُس نے قدرے ٹھہرتے ہوئے کہا۔

’’تم نے بھی مجھے اوروں کی طرح مرا ہوا سمجھ لیا‘‘۔

’’ہاں عمر مر چکا ہے کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتا تو کبھی بھی دو سال مجھ سے ملے بغیر نہ رہتا‘‘۔

’’جنت......کل پورے دو سال دس دن بعد تمھیں دیکھا......‘‘۔

’’اگر تم زندہ تھے تو کہاں تھے اب تک واپس کیوں نہیں آئے‘‘ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''بس یوں سمجھ لو کہ ایک ایسی دلدل میں پھنس گیا تھا کہ جہاں سے نکلتے نکلتے دو سال لگ گئے'' اُس نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔

''کتنی آسانی سے تم نے دو سال کہہ دیے لیکن میرے لیے یہ دو سال دو صدیوں کے برابر تھے......تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے یہ عرصہ کس طرح گزارہ ہے''۔

''میں تمھارا گنہگار ہوں جنت لیکن میرا یقین کرو یہ عرصہ میرے لیے بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا میں تو تم لوگوں سے دوبارہ ملنے کی اُمید بھی چھوڑ چکا تھا یہ تو شاید تم لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں دوبارہ یہاں تک آن پہنچا''۔

''عمر......م......میری......ش......شادی ہو چکی ہے'' اُس نے روتے ہوئے بالآخر کہہ دیا۔

''جانتا ہوں...... تمھیں پتا ہے یہاں آنے سے پہلے میرے دل میں اک خلش تھی کہ پتا نہیں تم کس حال میں ہو گی لیکن کل جب تمھیں اسد کے ساتھ خوش دیکھا تو میرے بے قرار دل کو سکون مل گیا اب میں خوشی خوشی واپس جا سکتا ہوں''۔

''ہاں عمر واپس چلے جاؤ ویسے بھی اب تمھارے لیے یہاں کچھ نہیں رہا'' اُس نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......گھر میں سب ٹھیک تو ہے'' اُس کے رونے سے عمر کا دل بھی دہل گیا تھا۔

''تم گھر نہیں گئے......؟''۔

''دل تو بہت چاہتا ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر امی نے روک لیا تو پھر واپس نہیں جا سکوں گا''۔

''بے فکر ہو کہ جاؤ تمھیں اب کوئی نہیں روکے گا''۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو'' عمر کو اُس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں جب وہاں کوئی ہے ہی نہیں تو پھر کون روکے گا''۔

''کیوں......سب گھر والے کہاں......؟'' اُسے فکر ہو رہی تھی۔

''اللہ تعالیٰ کے پاس'' جنت کے منہ سے یہ سُن کر تو جیسے کوئی قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی موبائل اُس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔

''کیا ہوا عمر سب ٹھیک تو ہے'' خدا بخش نے اُس کے ہاتھ سے موبائل گرتا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

''امی......بابا......'' وہ بالکل دیوانہ سا ہو گیا تھا اور اُس نے خدا بخش کو اپنے سامنے سے ہٹایا اور باہر کی جانب بھاگ گیا۔

☆......☆......☆

''ہم آپ کو ایک تازہ ترین خبر سے آگاہ کرنے جا رہے ہیں خبر یہ ہے کے لاہور کے علاقے میں ایک گھر سے ایک آدمی کی لاش ملی ہے اور اُس آدمی کی موت گولی لگنے سے ہوئی ہے۔ پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر کے کیس کی تحقیقات شروع کر دی ہے۔ پولیس نے مکان کے مالک کو حراست میں لے کر اُس سے بھی پوچھ گچھ کی جس سے پتا چلا ہے کے مرنے والے شخص کا نام جابر تھا

جس کا تعلق سوات سے تھا اور وہ اس گھر میں کرائے پر رہائش پذیر تھا اور اُس کے جسم پر چھ گولیاں لگنے کے نشان موجود ہیں'' مولانا نے اپنا ٹی وی آن کیا تو ایک نیوز چینل پر ایک خاتون خبر سے آگاہ کر رہی تھی۔

جابر کی موت کی خبر سُن کر مولانا آپے سے باہر ہو گیا اور ٹیلیوزن اُٹھا کر زمین پر دے مارا جس سے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

''نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے یہ کون میرا نیا دشمن پیدا ہو گیا کس کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے کے وہ میرے آدمی کی جان لے سکے'' مولانا غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

مولانا اُس وقت اتنے غصے میں تھا کے اپنے اردگرد کی ہر چیز کو ختم کر دینا چاہتا تھا اکبر اور دیگر ساتھیوں نے بمشکل اُسے سنبھالا۔ مولانا کو دکھ جابر کی موت کا نہیں تھا بلکہ وہ تو اس لیئے پریشان تھا اب اُس کے کام کا کیا ہو گا۔

☆......☆......☆

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل بھاگ رہا تھا اور خدا بخش بھی اُس کے پیچھے تھا۔ اُسے اس وقت کسی چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ بھاگتے بھاگتے کتنی دور نکل آیا تھا۔ ایک طویل مسافت طے کرنے کہ بعد اب وہ اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ گھر میں سب کچھ ویسا کا ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا البتہ ہر چیز پر مٹی کی ایک موٹی سی تہ جمی ہوئی تھی۔

''عمر تم آ گئے بیٹا'' اُسے امی کی آواز سنائی دی۔

''میں آ گیا امی......'' اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کہاں تھے اب تک......کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں''۔

''سوری امی مجھے آنے میں دیر ہو گئی''۔

''کوئی بات نہیں ہاتھ منہ دھو میں تمھارے لیے کھانا لگا دیتی ہوں''۔

''نہیں امی مجھے کھانے کی بھوک نہیں ہے میں تو صرف آپ کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں'' اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''عمر کس سے بات کر رہے ہو'' اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جنت اُس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''میں امی سے بات کر رہا ہوں اتنی دیر بعد آیا ہوں تو وہ ناراض ہو گئی ہیں''۔

''یہاں تو ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں'' جنت اُس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

''پاگل ہو گئی ہو تم......امی میرے سامنے کھڑی ہیں اور تم کہہ رہی یہاں کوئی بھی نہیں''۔

''ہوش میں آؤ عمر......یہاں کوئی نہیں ہے'' اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''امی آپ ہی جنت کو سمجھا......اُس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یکا یک تمام نظارہ بدل چکا تھا سب چیزوں پر مٹی کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی، کھڑکی سے اندر آنے والی ہوا کے زور سے برامدے میں پڑی کرسی جھول رہی تھی جس پر کبھی دادی بیٹھا کرتی تھیں لیکن اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے ٹیبل پر نظر روحا کی کتابیں پڑی ہوئیں تھی لیکن وہاں روحا نہیں تھی، بابا کا چشمہ بھی وہیں تھا لیکن بابا نہیں تھے کچن کا کھلا ہوا دروازہ چیخ چیخ کر سناٹے کی دوہائی دے رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اُس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی وہ ڈرام سے گھٹنوں کے بل گر گیا تھا۔

''عمر......'' جنت نے آگے بڑھ کر اُسے سہارہ دینے کی کوشش کی۔

''یہ میرا گھر تو نہیں ہے''......اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میرا گھر ایسا تو نہیں تھا......یہ سب کیسے......'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

”اُس دن تمھارے آنے کی خبر سُن کر ہم سب بہت خوش تھے لیکن بہت جلد ہماری خوشیاں غم میں تبدیل ہو گئی، میں اور روحا ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک کراچی سٹیشن پر دھماکے کی خبر سُنی یہ خبر سُن کر تو جیسے کوئی پہاڑ سا گر گیا تھا۔ پھر ہماری رہی سہی اُمید بھی ختم ہوگئی جب تمھاری گھڑی وہاں پڑی ہوئی ملی“ وہ اُسے خود پر گزری ہوئی روداد سنا رہی تھی اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے چپ چاپ سنتا رہا۔ بڑے ابو کو تمھاری موت کی خبر برداشت نہیں ہوئی اور اُنھیں اُسی وقت ہارٹ اٹیک آ گیا اور پھر ہسپتال میں اُن کی موت ......“ اُس نے قدرے ٹھہرتے ہوئے کہا۔

”ابھی بڑے ابو کا جنازہ گھر سے نکلا بھی نہیں تھا کہ دادی جان نے بھی اس ظالم دنیا سے منہ پھیر لیا......وہ دن ہمارے لیے قیامت سے کم نہیں تھا جب اس گھر سے ایک دن میں تین جنازے اُٹھے تھے“ اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”امی......اور......روحا“ اُس کے منہ سے بمشکل اتنا ہی نکلا تھا۔

”یہ حادثہ ہم نے تو کسی نہ کسی طرح برداشت کرلیا لیکن اُس کا معصوم دل یہ سب برداشت نہیں کرسکا، اُس دن کے بعد وہ اکثر بیمار رہنے لگی تھی اور تمھیں بڑے ابو اور دادی کو یاد کرکے روتی رہتی تھی ہم سب نے اُسے دلاسہ دینے کی بہت کوشش کی لیکن ہمارا پیار اور دلاسہ اُس کے زخموں کا مرحم نہ بن سکا اور ٹھیک دو مہینوں کے بعد وہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی اور میری شادی کے بعد بڑی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں“۔

”اللہ یہ کیا ہوگیا ایک جھوٹی خبر کی وجہ سے ایک سال میں دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا پورا خاندان ہی ختم ہوگیا“ وہ غم کے مارے تڑپ رہا تھا۔

”لیکن اگر تم زندہ تھے تو واپ...... ہا......ہ“ اُس نے خدا بخش کو دروازے سے اندر آتے دیکھ کر چیخ ماری جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

”یہ لو اپنی بندوق سنبھالو تم نے راستے میں گرادی تھی“ وہ سمجھ رہی تھی کہ خدا بخش عمر کو مارنے آیا ہے لیکن اُسے اپنی بندوق عمر کی طرف بڑھاتے ہوئے دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی تھی۔

”عمر...... یہ سب......“ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

"بتایا تھا نہ کہ ایک دلدل میں پھنس گیا تھا یہی ہے وہ دلدل"۔

"عمر تم تو محبت بانٹنے والے تھے پھر یہ سب" اُسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھ لو وقت اور حالات نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا"۔

"کہاں جا رہے ہو" وہ اُٹھ کر جانے لگا تو اُسے نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"وہیں جہاں سے آیا تھا......"۔

"واپس آؤ گے" اُس نے نم آنکھوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

"واپس آنا ہوتا تو جاتا ہی کیوں" اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ دیر رُک جاؤ" اُس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا۔

"کس کے لیے" اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

جنت کو اپنی بات پر شرمندگی ہوئی کیونکہ اب وہ کسی اور کی امانت تھی اور اُسے عمر کو روکنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

"جنت مجھے بہت خوشی ہے کہ امی نے تمھاری شادی کروا دی ورنہ اپنے گھر والوں کی موت کے الزام کے ساتھ ساتھ مجھ پر تمھاری زندگی برباد کرنے کا الزام بھی لگ جاتا"۔

"چلتا ہوں ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا" وہ الوداعی کلمات ادا کر کہ چلا گیا اور جنت آنکھوں میں آنسو لیے اُسی جاتا دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

عمر اور خدا بخش واپس قبیلے میں پہنچے تو وہاں جشن کا سماں تھا۔ جابر کی موت کی خبر سُن کر امیر صاحب اور اُن کے قبیلے میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ گئی حسن اور آزاد بھی اپنی پہلی کامیابی پر بہت خوش تھے۔

"آجا میرے شیر تم نے جابر کو مار کر اُس مولانا کی قمر توڑ دی ہے" حسن نے عمر کی قمر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"تم تو اُس سے کیمپ کا پتا پوچھنے کے لیے گئے تھے تو کچھ بتایا اُس نے" آزاد نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

عمر اپنے گروپ میں ایک نئے چہرے کا اضافہ دیکھ کر کچھ اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

''یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے'' عمر نے قدرے حیرت سے حسن اور آزاد کو دیکھا۔

''یہ عائشہ گل ہے...... ہمارے امیر علی گل کی بیٹی'' اُن دونوں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی خدا بخش نے جواب دیا۔

''قاری صاحب کی بیٹی...... پہلے تو اسے یہاں نہیں دیکھا'' عمر کے لہجے میں حیرت برقرار تھی۔

''کچھ عرصہ پہلے جب حالات خراب ہوئے تو امیر صاحب نے اپنی بیٹی کو اپنے بھائی کے پاس اسلام آباد بھیج دیا تھا اب حالات کافی بہتر ہو گئے ہیں تو اس لیے واپس آ گئی ہے''۔

''ایک بات اور جو تم دونوں نہیں جانتے'' آزاد نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی کونسی بات ہے عائشہ گل کے بارے میں جو میں نہیں جانتا'' خدا بخش نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''عائشہ گل کی بہت جلد شادی ہونے والی ہے''۔

''شادی...... کس سے'' اب چونکنے کی باری خدا بخش کی تھی۔

''سنا ہے کہ عائشہ گل کے بچپن کا منگیتر ہے''۔

''واقعی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم''۔

''چلو بہت جلد معلوم ہو جائے گا ابھی تم لوگ تھک گئے ہو گے جا کہ آرام کر لو'' عمر نے اپنا بیگ حسن کو دے دیا اور خود اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

''عمر کیا بات ہے یار جب سے تم لاہور سے واپس آئے ہو نہ ہی اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہو، کھانا کھاتے وقت بھی تمھارا دھیان کہیں اور ہی ہوتا ہے، سب کچھ ٹھیک تو ہے'' حسن نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہے بس تھوڑی سے طبیعت خراب ہے''۔

''لاہور میں جنت سے ملاقات ہوئی تھی'' حسن نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں'' اُس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک تو......''۔

''جنت کی شادی ہوگئی'' عمر نے تیزی سے حسن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے میرا مطلب ہے کہ اگر ساری زندگی وہ تیری یاد میں بیٹھی رہتی تو کیا تجھے اچھا لگتا''۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو حسن......میری پریشانی کی وہ وجہ نہیں ہے''۔

''تو پھر کیا پریشانی ہے یار مجھے بھی نہیں بتاؤ گے'' حسن نے جذبات کا سہارہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں......اپنے......گھر گیا تھا''۔

''تو گھر والوں نے کچھ کہا''۔

''کاش کہ وہ کچھ کہتے......'' اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا......؟''۔

''تجھے یاد ہے اُس دن جو سٹیشن پر دھماکہ ہوا تھا اُس سے ایک دن پہلے میں نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ میں گھر واپس آرہا ہوں اور پھر اُس دن سٹیشن پر دھماکہ ہوگیا۔ گھر والوں نے سمجھا کہ میں......میں......اُس دھماکہ میں مر چکا ہوں'' اُسنے غم اور غصے کی ملی جُلی حالت میں کھڑکی پر ہاتھ دے مارا۔

''ہاں تو ٹھیک ہی ہے نہ یار گھر والوں کے لیے تو ہم مر ہی چکے ہیں''۔

''ہم مر جاتے تو ٹھیک تھا یار لیکن...... میرے تو گھر والے ہی......'' اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

''کیا مطلب......؟''۔

''اُس دن......دھماکہ کے بعد...... مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا پتا نہیں کیسے میری گھڑی اور موبائل وہاں گر گئے'' اُس نے ٹھہرتے ہوئے کہا۔ ''کسی نیوز چینل پر سٹیشن کے مناظر دکھائے جا رہے تھے کہ گھر والوں کی نظر میری گھڑی پر پڑھ گئی اور پھر......'' اُس نے سارا واقعہ حسن کو سنا دیا۔

''اوہ میرے خدایا......یقین نہیں آتا کہ اتنا کچھ ہوگیا اور ہمیں خبر ہی نہیں تھی'' حسن بھی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اگر میں لاہور نہ جاتا تو شاید اب بھی نہ ہوتی''۔

''کاش کہ اُس دن وہ بم دھماکہ نہ ہوتا'' اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”وہ دھماکہ خاص ہمارے لیے کیا گیا تھا“۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟“حسن کو یہ سُن کر زور کا جھٹکا لگا تھا۔

جابر نے مجھے بتایا تھا کہ مولانا کہ کہنے پر اُسی نے ہی سٹیشن پر بم رکھا تھا“۔

”تو اسی لیے تم نے جابر کو مار دیا“۔

”جابر تو کیا تم دیکھنا اب میں اُس مولانا کا کیا حال کرتا ہوں اُس کی وجہ سے میرا پورا خاندان ختم ہو گیا“۔

”کیا تمھارے پاس......میرے گھر والوں کی کوئی خبر“حسن کو بھی اپنے گھر والوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

”ہاں تمھارے ابا اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور تمھاری بہن کی شادی ہو گئی ہے“اُس نے حسن کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

”یہ سب آزاد کی وجہ سے ہوا ہے نہ وہ بے صبری دکھاتا نہ ہمیں پولیس پکڑتی اور نہ ہی آج یہ سب ہوتا“حسن نے آزاد کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

”اُس مولانا نے جو کیا ہے اُس کی تو جان میں لے کر ہی رہوں گا لیکن میں آزاد کو بھی کبھی معاف نہیں کروں گا“عمر بھی حسن کی بات سے متفق تھا۔

”ارے تم لوگ یہاں ہو میں کب سے تم لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں“خدا بخش نے ڈھڑام سے دروازہ کھولا تو اُنھوں نے تیزی سے اپنے آنسوں پونچھ لیے۔

”کیوں کوئی ضروری کام تھا“عمر نے سوال کیا۔

”ارے یار کل شادی کی تقریب ہے اور اتنے سارے کام ہیں کرنے کے لیے“۔

”تم چلو ہم آتے ہیں، یہ سب باتیں بعد میں کریں گے فی الحال قاری صاحب کی بیٹی کی شادی ہے اُنھوں نے بہت کچھ کیا ہے ہمارے لیے باقی تم فکر نہ کرو اگر اللہ پاک نے چاہا تو اُس مولانا سے ایک ایک چیز کا حساب لیں گے“حسن نے عمر کو تسلی دی اور وہ دونوں باہر آ گئے۔

☆......☆......☆

”ارے عمر، حسن صبح سے کہاں ہو یار تم لوگ اتنے سارے کام ہے اور تم غائب ہو“خدا بخش نے اُنھیں

بازار سے آتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں تو آزاد کو چھوڑ کر گئے تھے نہ تمھارے پاس وہ کہاں ہے''۔

''نہیں مجھے تو وہ صبح سے نظر نہیں آیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ تمھارے ساتھ ہے'' خدا بخش نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''نہیں ہم تو اکیلے گئے تھے وہ تو یہیں تھا''۔

''نورے......آزاد کو دیکھا ہے کہیں'' خدا بخش نے اپنے ایک ساتھی کو آواز لگائی۔

''ہاں میں نے اُسے پہاڑی کی طرف جاتے دیکھا تھا''۔

''ابے یار میں نے اُسے سمجھایا بھی تھا کہ اکیلا کہیں نہ جائے ہماری جان کو خطرہ ہے لیکن اس کی کھوپڑی میں کوئی بات گستی ہی نہیں ہے'' حسن نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم یہیں رُکو میں اُسے دیکھ کر آتا ہوں'' عمر نے حسن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ''۔

''نہیں شادی والا گھر ہے سو کام ہوں گے تم یہیں خدا بخش کے ساتھ رُکو میں دیکھ کر آتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے جاؤ'' حسن اور خدا بخش کام میں مصروف ہو گئے اور عمر آزاد کی تلاش میں پہاڑی کی طرف چلا گیا۔

☆......☆......☆

''تم...... یہاں...... یہاں بیٹھے ہوئے ہو میں کہاں کہاں تمھیں ڈھونڈ کر آیا ہوں'' بھاگ بھاگ کر اُس کا سانس پھول گیا تھا۔

''کیوں تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے'' اُس نے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

''کیوں کا کیا مطلب ہے یار تجھے تو پتا ہے کہ ہماری جان کو خطرہ ہے'' عمر اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں ہوتا تم جاؤ میں ابھی کچھ دیر اور یہاں رُکنا چاہتا ہوں''۔

''اگر زیادہ دیر یہاں رُکے تو جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے'' عمر نے اُسے خطرات سے آگاہ کیا۔

''ایسی زندگی سے تو موت ہی اچھی ہے'' اچانک سے اُس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''خیر تو ہے آج...... یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو''۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں یار کیا فائدہ ہے ایسی زندگی کا جس کی وجہ سے کئی زندگیاں برباد ہو گئیں'' آنکھوں سے آنسوں بھی بہنے لگے تھے۔

''ہم نے جو کچھ کیا ہے ہم اُس کی توبہ کر چکے ہیں تو پھر اور کیا چاہتے ہو تم''۔

''کاش اُس دن میں نے جلد بازی نہ دکھائی ہوتی تو آج ہم لوگوں کی یہ حالت نہ ہوتی اور تمھارے گھر والے بھی ٹھیک ہوتے اور تم مجھ سے ناراض بھی نہ ہوتے'' وہ اُن لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔

عمر نے بھی مارے شرم کے اپنا سر جھکا دیا۔

''مجھے نفرت ہو رہی ہے اپنے آپ سے میں کس طرح کا دوست ہوں جس نے اپنے ہی دوستوں کی زندگیاں برباد کر دیں''۔

''آزاد جو ہونا تھا سو ہو گیا اب چھوڑ ان سب باتوں کو اور چل وہاں سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں'' عمر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

''ایک بات مانو گے'' عمر نے اپنا رُخ دوسری طرف کیا تو اُس نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہوں'' اُس نے دوبارہ اپنا رُخ اُس کی طرف کیا۔

''ایک گولی ہی مار دے یار میرے بے قرار دل کو سکون مل جائے گا کب سے یہاں بیٹھ کر یہی سوچ رہا تھا لیکن خودکشی حرام ہوتی ہے نہ'' اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اُس کے منہ سے یہ بات سُن کر عمر کی آنکھوں میں بھی آنسوں آ گئے تھے، اُس نے آگے بڑھ کے آزاد کو گلے لگایا۔

''مجھے معاف کر دے یار گھر والوں کی موت کی خبر سُن کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اس لیے غصے میں وہ سب کہہ دیا میں یہ بھول گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو بھی کرتا ہے اُس میں ہمارے لیے کوئی بہتری ہی ہوتی ہے''۔

''پھر بھی یار قصور تو میرا ہی تھا نہ''۔

''قصور تمہارا نہیں تھا تم نے تو ہمیں کہا تھا کہ وہاں سے چلے جاؤ لیکن ہم نہیں گئے اس لیے اپنے آپ کو ہلقان نہ کرو جو ہماری قسمت میں تھا ہو گیا'' وہ اب بھی بدستور اُس سے لپٹا ہوا تھا۔

''لیکن پھر بھی......''۔

''اگر اب تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو سچ میں تجھے گولی مار دوں گا'' عمر نے اُسے اپنے آپ سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

آزاد کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کہ چل دیا۔

☆......☆......☆

آزاد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اُس مولانا نے اُن تینوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے اُس کے بھائی کو مروایا۔ وہ اپنا سارا غصہ مولانا پر نکال دینا چاہتا تھا اُس نے عمر کا موبائل اُٹھایا اور اُس میں سے مولانا کا نمبر ملایا اور اپنی ساری بھڑاس نکال دی۔

''کتے کمینے تجھے شرم نہیں آئی صرف ہمیں اپنے جال میں پھنسانے کیلئے تو نے اتنے سارے لوگوں کی جان لے لی'' جیسے ہی مولانا نے فون اُٹھایا تو وہ اُسے گالیاں دینے لگا۔

''ہاں میں ہوش میں ہی ہوں لیکن اب بہت جلد تمھارے ہوش اُڑ جائیں گے''۔

''جابر کی موت سے تیری کمر تو ٹوٹ ہی چکی ہے اب میں بہت جلد تیری گردن بھی توڑ دوں گا'' مولانا نے کچھ کہا تو آزاد نے بھی بھرپور جواب دیا۔

''ہاں جابر کو تو عمر نے صرف چھ گولیاں ماری ہیں نہ میں تیرے جسم کے ہر حصے میں گولی ماروں گا اور وہ بھی بہت جلد......'' وہ اور بھی بہت کہنا چاہتا تھا لیکن قدموں کی آہٹ سُن کر رُک گیا۔

عمر......تت......تم'' عمر کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔

''خیر تو ہے تیرے چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں''۔

''نہیں کچھ نہیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں خیریت'' اُس نے موبائل عمر کی نظروں سے بچا کر اپنے

تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"یہ حسن کو کیا ہوا ہے بڑا خاموش خاموش سا ہے ہم تو اُسے بچپن سے جانتے ہیں اتنی دیر چپ پہلے تو کبھی نہیں رہا" وہ وہیں آزاد کے پاس بیٹھ گیا اُسے حسن کی فکر ہو رہی تھی۔

"محبت ہو گئی ہے شہزادے کو"۔

"محبت......لیکن کس سے" عمر کو ایک پل کے لیے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"عائشہ گل سے"۔

کیا عائشہ گل......قاری صاحب کی بیٹی"۔

"اصل میں جس دن تم اور خدا بخش لاہور گئے اُسی دن عائشہ گل واپس آ رہی تھی تو قاری صاحب نے ہمیں اُسے لینے کے لیے بھیج دیا، جب حسن نے عائشہ گل کو دیکھا تو اس کے تو طوطے ہی اُڑ گئے، پہلی نظر میں ہی دیوانہ ہو گیا تھا، بیچارہ حسن محبت کی بھی تو ایسی لڑکی سے جس کی آج شادی ہے" آزاد نے اُسے ساری روداد سناتے ہوئے کہا۔

"محبت ارادتاً نہیں ہوتی میرے دوست بلکہ یہ تو جسے چاہتی ہے اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے اور پھر جو بھی اس کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ ساری زندگی اس کی اذیت میں ہی تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اُسے کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا، بے وقوف ہے حسن میری صورت میں اُس کے سامنے ایک زندہ مثال تھی لیکن پھر بھی وہ محبت کا شکار ہو گیا" اُسے اُس کی قسمت پر افسوس ہو رہا تھا۔

"خیر اب وہ محبت کے جال میں پھنس ہی گیا ہے تو ہم صرف دعا کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں"۔

"اگر پہلے پتا ہوتا تو میں ایک بار قاری صاحب سے اس بارے میں ضرور بات کرتا"۔

بات کر بھی لیتے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ قاری صاحب نے بچپن میں ہی عائشہ گل کی نسبت طے کر دی تھی اور تم اچھی طرح جانتے ہو یہ لوگ جان تو دے سکتے ہیں لیکن زبان سے پھر نہیں سکتے"۔

"کاش......کسی کو تو اُس کی محبت نصیب ہو جاتی" اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اللہ سے دعا کرو بھائی کہ وہ حسن کو یہ سب برداشت کرنے کا حوصلہ دے......"۔

''آمین'' دونوں نے یک زبان ہو کر کہا

☆......☆......☆

شادی کی خوشی میں خدا بخش اور باقی کچھ لوگ اپنا مقامی ڈانس کر رہے تھے اور باقی لوگ اُس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بارات کے استقبال کے بعد سب لوگ نکاح میں شرکت کے لیے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن حسن وہیں کھڑا رہا۔

''کیا بات ہے اندر نہیں چلو گے''۔

''نہیں یار بارات کے لیے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے تم جاؤ میں یہی ٹھیک ہوں'' عمر کے پوچھنے پر اُس نے بہانہ بنایا۔

حسن...... پیار کرتے ہو عائشہ گل سے'' وہ بے اختیار بول پڑا۔

''ن...... نہیں...... تم سے کس نے کہا'' اُس نے صاف انکار کر دیا۔

''تمھاری آنکھیں کہہ رہی ہیں......'' اُس کی یہ بات سُن کر حسن خاموش ہو گیا۔

''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا شاید میں کچھ کر سکتا تمھارے لیے''۔

''کیا بتاتا یار مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ جو میں اُس کے بارے میں سوچتا ہوں وہ بھی میرے بارے میں سوچتی ہے یا نہیں اور ویسے بھی قاری صاحب کے بہت احسانات ہیں ہم پر میں اُنھیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا''۔

''کیا بات ہے'' اُس نے حسن کی دل جوئی کے لیے گلے سے لگا لیا تھا۔

'ویسے تجھے دیکھ کر مجھے وہ کسی کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی''۔

''کونسی بات''۔

''ابے وہی یار جو کالج میں اُستاد صاحب نے بتائی تھی...... اصل عاشق وہی ہوتا ہے جو اپنے محبوب کی شادی میں خود اپنے ہاتھوں سے کرسیاں لگاتا ہے'' اُس نے موڈ کو ہلکا کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں کرسیاں تو نہیں لگا رہا...... بلکہ دیگیں پکوا رہا ہوں''۔

''اچھا یعنی کے تم نے تو ایک نئی مثل قائم کر دی'' عمر نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔

”بکواس نہ کر یار......“۔

”اچھا چل ٹھیک ہے میں اندر جا رہا ہوں تم دیگیں پکواؤ“۔

”خدا بخش برتن لگواؤ یار کھانا تیار ہونے والا ہے“ عمر کے جاتے ہی اُس نے خدا بخش کو آواز دی۔

”بلند بخت خان ولد سکندر بخت خان کیا آپ کو عائشہ گل ولد محمد علی گل اپنے نکاح میں قبول ہے“ قاضی صاحب کے علاوہ سب خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ بلند بخت کے منہ سے کوئی آواز نکلتی باہر ہونے والے ذوردار دھماکہ سے سب کے دل دہل گئے تھے۔

☆......☆......☆

دھماکے کی آواز سُن کر سب باہر کی جانب بھاگے حسن اور خدا بخش ہاتھوں میں بندوقیں لیے اپنی پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے آزاد اور عمر بھی اپنی بندوقیں لے کر آ گئے اور پھر لڑائی اور شور شرابے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آدھے گھنٹے چلتا رہا۔

بلند بخت اور سکندر بخت مر چکے تھے قاری صاحب کے سینے میں گولی لگی ہوئی تھی اور عائشہ گل اور عمر اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

”بابا یہ آپ کو کیا ہو گیا“ وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”قاری صاحب ہمت کریں کچھ نہیں ہو گا آپ کو“ عمر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میری فکر مت کرو......مج ...... مجھے جو ہونا تھا وہ ہو گیا......میری زندگی میری بیٹی ہے......اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے“۔

”آپ فکر نہ کریں قاری صاحب جب تک میں زندہ ہوں عائشہ گل کو کچھ نہیں ہو گا“ عمر نے قاری صاحب کو یقین دہانی کروائی۔

”میرے مرنے کے بعد اپنا مقصد ضرور ...... پو......را......کر“ قاری صاحب نے آخری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

”بابا“ عائشہ گل کی چیخ پورے گاؤں میں گونجی تھی۔

”میں تمھارا درد سمجھ سکتا ہوں قاری صاحب مجھے بھی اپنے بابا کی طرح عزیز تھے لیکن یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے اس لیے چلو یہاں سے“۔

”میں بابا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی“۔

”میں نے قاری صاحب سے تمھاری حفاظت کا وعدہ کیا ہے میں تمھیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا“ اُس نے اپنا وعدہ یاد کرواتے ہوئے کہا۔

”میرے بابا کی لاش بے کفن یہاں پڑی ہوئی ہے اور تم مجھے یہاں سے بھاگنے کے لیے کہہ رہے ہو“ اُس نے نم آنکھوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

”دیکھو قاری صاحب نے کہا تھا کہ اُن کی زندگی تم ہو اور مجھ پر قاری صاحب کے بہت سے احسانات ہیں اس لیے میں تمھیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا اب ضد چھوڑو اور چلو یہاں سے“ عمر نے زبردستی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور وہاں سے لے کر نکل گیا۔

☆......☆......☆

”یہ کس جگہ لے آئے ہو تم مجھے یہاں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے“ غار میں داخل ہوتے ہی اُس نے شکوہ کیا۔

”ہمارا اس جگہ کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں ایمان کی روشنی نصیب ہوئی تھی“ اُس نے اوپر کی طرف نظر دوڑائی۔

”کیا مطلب ایمان کی روشنی کیا تم پہلے ایمان والے نہیں تھے“۔

چھوڑو اس بات کو تم نہیں سمجھو گی تم بس یہ تسلی رکھو کہ یہاں اندھیرا تو ہے لیکن یہ جگہ محفوظ ہے یہاں تمھیں کوئی خطرہ نہیں ہے اس لیے تم یہی رکو میں حسن اور آزاد کو لے کر آتا ہوں اور واپس آتے ہوئے تمھارے کچھ کپڑے بھی لے آؤں گا“۔

”نہیں میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی باہر جاؤں تو شاید گولی سے مر جاؤں گی لیکن یہاں رہی تو خوف سے مر جاؤں گی“۔

’’نہیں میں تمھیں اپنے ساتھ.........‘‘قدموں کی چاپ کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گیا۔
’’لگتا ہے اب ہمیں جانے کی ضرورت نہیں ہے وہ دونوں خود ہی یہاں آ گئے ہیں تم یہی رکو میں دیکھتا ہوں
’’جیسے ہی اُس نے قدم باہر نکالا گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔
’’میرے پاس صرف چھ گولیاں ہیں اور یہ تو دس بارہ لوگ ہیں‘‘اُس نے اپنی بندوق میں گولیاں ڈالتے ہوئے کہا۔
’’تو اب ہم مر جائیں گے‘‘اُس نے پھر سے رونے والی شکل بنائی۔
’’جب تک میں زندہ ہوں تب تک تو تمھیں کچھ نہیں ہو گا ہمیں‘‘عمر نے اُس کو حوصلہ دیا۔
جھوٹی تسلیاں نہ دو ہمارے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے کاش کہ میں وہیں بابا کے ساتھ رہتی تو موت کا کوئی غم نہیں ہوتا‘‘۔
’’خدا کے لیے اپنی بکواس بند کرو اس وقت تم دلہن کے جوڑے میں اور میں نے سنا ہے کہ دلہن کی دعا پوری ہو جاتی ہے اس لیے اپنے منہ سے کم از کم اچھی باتیں نکالو‘‘عمر نے نشانہ باندھ کر دو تین کو مارا تو حسن اور آزاد بھی وہاں آن پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن سب کو مار گرایا۔
’’تم دونوں ٹھیک تو ہو‘‘حسن نے غار کے اندر داخل ہوتے ہی پہلا سوال کیا۔
’’اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم دونوں آ گئے ورنہ آج تو مجھے موت نظر آنے لگی تھی‘‘عمر نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔
’’ہم نے اُن تمام حملہ آوروں کو مار گرایا ہے اور خدا بخش اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں لگا ہوا ہے‘‘آزاد نے اُنھیں تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔
’’ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم نہ ہی قاری صاحب کو بچا سکے اور نہ ہی تمھارے منگیتر کو‘‘حسن نے عائشہ گل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
’’دیکھو اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو مجھے یہاں سے لے چلو مجھے بابا کے پاس جانا ہے‘‘۔
’’گل ابھی کچھ دیر یہاں رک جاؤ تھوڑی دیر بعد چلتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ابھی کوئی دشمن یہیں کہیں چھپا ہوا ہو‘‘

''ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو نہیں جانا تو میں جا رہی ہوں'' جیسے ہی وہ باہر کی جانب بڑھی عمر بھی اُس کے پیچھے ہولیا۔ اُس کی نظر اُس حملہ آور پر پڑھ گئی تھی جو پتھر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ عائشہ گل کو دیکھتے ہی اُس نے گولی چلا دی لیکن عمر نے کمال مہارت سے اُسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور گولی اُس کی کمر میں گھس گئی۔

☆......☆......☆

دو دن گزر چکے تھے اُس واقعے کو لیکن ابھی تک ہر گھر سے سوگ کی صدائیں آ رہی تھیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر پیٹ کے بل نیند کی وادیوں میں گم تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے'' اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھوں سے پردہ ہٹایا تو جنت کو اپنے سامنے پایا۔

''جنت...... مجھے پتا تھا کہ مجھے تکلیف میں دیکھ کر تم ضرور آؤ گی''۔

''جنت......کون جنت'' اس بار اُس نے اُسے زور سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

اُس نے اپنی آنکھیں ٹھیک سے کھول کر دیکھا تو وہ جنت نہیں بلکہ عائشہ گل تھی۔

''میں......کہاں......ہوں''۔

''آپ اس وقت میرے گھر میں ہیں......جس دن آپ کو گولی لگی تھی اُس کے بعد آپ کے دوست آپ کو یہاں لے آئے اُس دن سے آپ یہیں ہیں''۔

''مجھے......گولی'' اُس نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ نے بابا سے میری حفاظت کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ آپ اپنے وعدے کہ اتنے پکے ہوں گے کہ میری طرف آنے والی موت کو اپنی طرف موڑ لیا'' عائشہ گل نے کھڑکی سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمھاری جان صرف اس لیے نہیں بچائی کہ میں نے تمھارے بابا سے وعدہ کیا تھا بلکہ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے'' اُسے نے اُسی انداز میں لیٹے ہوئے کہا۔

''دوسری وجہ......اور کونسی وجہ ہے'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یاد ہے اُس دن جب تم مجھ سے غار میں جھگڑ رہی تھی اُس وقت مجھے تم میں اپنی بہن نظر آئی وہ مجھ سے

بہت چھوٹی تھی لیکن اُسی طرح مجھ سے جھگڑا کرتی تھی جس طرح تم اُس رات......" "اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"لگتا ہے بہت پیار کرتے ہیں آپ اپنی بہن سے کہاں رہتی ہے وہ......"۔

"وہیں جہاں تمھارے بابا ہیں" اُلٹا لیٹنے کی وجہ سے آنسو اُس کی ناک سے ہو کر ایک آنکھ سے دوسری میں جا رہے تھے۔

"کیا......؟" وہ شرمندہ سی ہوگئی تھی

"اُس کا نام کیا تھا......؟"۔

"روحا نام تھا وہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی سب کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی تھی لیکن پیار بھی بہت کرتی تھی"۔

"کیا روحا کو کوئی بیماری تھی"۔

"نہیں کوئی بیماری نہیں تھی بس میری موت کی جھوٹی خبر نے اُس معصوم کی جان لے لی"۔

"آپ کی موت کی جھوٹی خبر کس نے پھیلائی تھی" اُسے تجسس ہوا۔

بس تھا ایک بدبخت جس نے ایک ایسی افواہ اُڑائی کہ میرا پورا خاندان ہی تباہ ہو گیا"۔

"ہر انسان کی موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ کسی نہ کسی بہانے تو آ کر ہی رہے گی......اچھا خیر اب بچوں کی طرح رونا بند کیجیے اور اُٹھ کر کھانا کھالیں پچھلے دو دن سے آپ بے خوش پڑے ہوئے تھے جس وجہ سے جسم میں کافی کمزوری آ گئی ہوگی"۔

"حسن اور آزاد کہاں ہے" اُس نے بمشکل بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا لیکن قمر میں گولی لگنے سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"ارے لالا آرام سے ابھی زخم پوری طرح بھرا نہیں" اُس نے لالا کہا تو عمر نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا۔

"غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہماری زبان میں بھائی کو لالا کہتے ہیں"۔

’’وہ دونوں خدا بخش لالا کے ساتھ کسی سے ملنے کے لیے گئے ہوئے ہیں ابھی آتے ہی ہوں گے‘‘۔

’’شکریہ...... مجھے پھر سے میری بہن لوٹانے کیلئے لیکن لالا کی جگہ بھائی ہی کہو تو بہتر ہے‘‘ اُس نے پیار سے عائشہ گل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’عمر لالا......‘‘ اُس نے پھر سے لالا کہا تو عمر نے اُسے گھورا۔

’’اب میری زبان پر بھائی کی جگہ لالا آتا ہے تو میں کیا کروں‘‘ اُس نے رونذھی سی صورت بنائی۔

’’چلو ٹھیک ہے جو تمھاری مرضی ہے وہی کہو‘‘ وہ پھر سے وہیں بیٹھ گیا جس جگہ سے اُٹھا تھا۔

جب آپ ہوش میں آئے تو آپ نے کسی جنت کا نام لیا تھا یہ جنت کون ہے‘‘ اُس نے باتوں میں سوال داغ ہی دیا۔

’’جنت...... تھی ایک پاگل سی لڑکی‘‘ اُس کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

’’کیا وہ بھی اس دنیا سے......‘‘۔

’’نہیں نہیں اللہ کا شکر ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اُس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ بہت خوش ہے وہ اپنی زندگی میں‘‘

’’اُس کی شادی آپ کے ساتھ کیوں نہیں ہوئی‘‘ وہ سوال پہ سوال داغے جا رہی تھی۔

’’یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے‘‘ اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

’’لیکن میں پھر بھی یہ کہانی سننا چاہتی ہوں‘‘۔

’’ٹھیک ہے تو پھر سنو.................‘‘۔ اُس نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی روداد سنائی۔

☆......☆......☆

’’واقعی بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کو اُن کی محبت ملتی ہے‘‘ اُس کی کہانی اختتام پذیر ہو چکی تھی لیکن گل کی آنکھوں سے آنسو نہیں رُک رہے تھے۔

’’مجھے تو میری محبت نہیں ملی لیکن اگر تم چاہو تو کسی اور کو اُس کی محبت مل سکتی ہے‘‘۔

’’کیا مطلب‘‘ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔

’’میں حسن کی بات کر رہا ہوں...... وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے‘‘ اُس کی یہ بات سُن کر اُس نے اپنی نظریں

جھکادی تھیں۔

''گل قاری صاحب کی بہت خواہش تھی تمھاری شادی کی وہ تو اب نہیں رہے لیکن اگر میں تمھارا بھائی ہونے کی حیثیت سے تمھاری شادی حسن سے کروادوں تو کیا تم میرا فیصلہ قبول کرلوگی''۔

''بابا کے بعد آپ ہی میرے سب کچھ ہیں آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا مجھے قبول ہے لیکن اس وقت میں شادی نہیں کرسکتی'' اُس نے فرمانبردار بہن کی طرح سر جھکادیا۔

''خوش رہو میری پیاری بہن......قاری صاحب کے چالیسویں کے بعد جو جمعہ آئے گا اُس جمعے کی نماز کے بعد ہی میں تمھارا نکاح کروادوں گا اچھا ابھی میں باہر چلتا ہوں کافی سارے کام کرنے ہیں''۔

''لالا آرام سے ابھی آپ کا زخم بھرا نہیں''۔

''فکر نہ کرو جتنے زخم میں برداشت کرچکا ہوں اُس کے سامنے یہ زخم کچھ بھی نہیں ہے......تم کھانا تیار کرو میں ابھی آتا ہوں'' گل کا فیصلہ سن کر وہ بہت خوش تھا اور یہ خوشی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

جمعے کی نماز کے بعد مسجد میں حسن اور عائشہ گل کا نکاح پڑھایا گیا تھا۔حسن کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر عمر بھی مسکرا رہا تھا۔

آج اُس کے بے چین دل کو قرار مل گیا تھا کیونکہ آج کسی کو اُس کی محبت نصیب ہوئی تھی۔نکاح کے بعد رُخصتی کروائی گی عائشہ گل اپنے گھر سے وداع ہو کر اُس گھر میں آ گئی تھی جو قاری صاحب نے حسن عمر اور آزاد کو رہنے کے لیے دیا تھا اور آزاد وہاں سے نکل کر قاری صاحب کے گھر میں عمر کے ساتھ شفٹ ہو گیا تھا۔

تقریب ختم ہوتے ہوتے رات ہو چکی تھی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے آزاد بھی اپنے کمرے میں سو چکا تھا لیکن عمر چھت پر کھڑا سوچوں میں گم تھا۔عائشہ گل اور حسن کو ایک ساتھ دیکھ کر اُس کا دل بوجھل ہو گیا تھا کیونکہ اُس کے وہ تمام خواب پھر سے اُمڈ آئے تھے جو اُس نے جنت کے ساتھ دیکھے تھے۔

وہ پہلے ہی بوجھل کھڑا تھا کہ رم جم کی بوندیں برستی دیکھ کر ایسا لگا کہ آج آسمان بھی اُس کے ساتھ رو دیا ہو ۔اُس نے اپنی باہنیں کھول لیں اور آنکھیں بند کر کہ منہ اوپر آسمان کی طرف کر دیا۔رم جم کی بوندیں منہ پر پڑتے

ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور زور زور سے چلانے لگا۔

''اے میرے اللہ اے تمام جہانوں کے مالک بے شک تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور تو ہی تمام ترتعریفوں کے لائق ہے، تو ہی سب کا خالق و مالک اور مددگار ہے اور تو ہی ہر شے کا دکھ اور تکلیف دور کرنے والا ہے۔اے میرے مالک میں اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتا ہوں اب مجھ میں اور تکلیف برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ بے شک میرے گناہ بہت بڑے ہیں اور ان کے بدلے یہ غم اور تکالیف بہت کم ہیں جو تو نے مجھے عطا کی ہیں، اے میرے رب میں تیرا کمزور بندہ ہوں اور ان گناہوں کی وجہ سے میری کمر ٹوٹ چکی ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میرے گناہ بہت بڑے ہیں لیکن میرے تمام گناہ تیری رحمت کے آگے بہت چھوٹے ہیں، اپنی رحمت کے صدقے میرے تمام گناہ بخش دے اور یہ جو بارش اس وقت برس رہی ہے اسے میرے لیے رحمت کی بارش بنا دے، اے میرے رب مجھ پر اپنا ایسا کرم فرما کہ اس بارش کا ہر قطرہ جو مجھ پر گر رہا ہے وہ میرے جسم کے ساتھ میری روح کو بھی بھیگا کر پاک اور صاف کر دے، یا اللہ اس بارش کے پانی کو میری روح کے غسل کا سبب بنا اور میرے تمام گناہ معاف فرما کر مجھے اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرما، دور کر دے میرے دل سے اس دنیا کی ہر چیز کی محبت اور میرے دل میں صرف اپنی محبت پیدا فرما'' وہ اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے تھا لیکن بارش کے شور کی وجہ سے اُس کی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو رو لینے کے بعد اُس کا دل ہلکا ہو گیا تھا وہ جلدی سے بستر سے اُٹھا اور فجر کی نماز ادا کرنے چلا گیا۔

''عمر اب کیا سوچا ہے کیا کرنا چاہیے'' نماز کے بعد خدا بخش اور آزاد بھی اُس کے ساتھ ہی گھر آ گئے۔

''سوچنا کیا ہے یار پہلے ہی اُس مولانا کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اب یہ قاری صاحب کے دشمن بھی ہمارے پیچھے پڑھ گئے ہیں'' عمر کو ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

''نہیں عمر اُس دن جن لوگوں نے ہم پر حملہ کیا وہ قاری صاحب کہ دشمن نہیں تھے بلکہ وہ مولانا کے ہی آدمی تھے''۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو'' عمر کو یہ سُن کر زور کا جھٹکا لگا تھا۔

ہاں میں نے اُس دن اُن حملہ آوروں کے ساتھ اکبر کو دیکھا تھا'' آزاد نے انکشاف کیا۔

''لیکن اُسے کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟''۔

''جب تم نے مجھے جابر کے بارے میں بتایا تو میں غصے میں آ گیا اور میں نے تمھارے نئے نمبر سے جو تم لاہور سے لائے تھے مولانا کو فون کر کہ بہت برا بھلا کہا''۔

''یہ تو نے کیا کیا آزاد میں نے اُس دن پہاڑ پر ہی اپنی سمیں پھینک دی تھیں تا کہ مولانا ہمیں ٹریک نہ کر سکے اور تم نے اُس دن خود اُسے یہ موقع دے دیا''۔

''سوری یار غصے میں مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا'' عمر اُسے جھاڑنے لگا تھا لیکن آزاد کی روندھی شکل دیکھ کر اُس نے اپنا غصہ قابو کر لیا۔

''اب وہ موبائل کہاں ہے؟''۔

''موبائل تو میرے پاس ہے لیکن سم میں نے شہر جانے والی گاری میں پھینک دی تھی''۔

''موبائل کو سنبھال کہ رکھنا اُس میں موجود ریکارڈنگ مولانا کے خلاف ہمارے پاس اکلوتا ثبوت ہے''۔

''تم فکر نہ کرو وہ ریکارڈنگ بالکل محفوظ ہے'' آزاد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اب سب سے پہلے ہمیں حسن اور عائشہ کو یہاں سے دور اسلام آباد بھیجنا ہے اور اُس کے بعد اُس مولانا کو دیکھ لیں گے''۔

''حسن ہمیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا'' آزاد نے اپنا خیال بیان کرتے ہوئے کہا۔

''خدا بخش تم قاری صاحب کے بھائی سے بات کرو...... حسن کو جانا ہی ہو گا اب اُس کے ساتھ عائشہ گل کی زندگی جڑی ہوئی ہے''۔

''ٹھیک ہے میں ابھی جا کر اُنھیں اطلاع کر دیتا ہوں''۔

''اچھا ہمارے پاس جو اسلحہ ہے اُس کی کیا صورتحال ہے'' خدا بخش کے جاتے ہی اُس نے اسلحے کا جائزہ لیا۔

''ہمارے پاس اسلحہ برائے نام ہے اور وہ بھی پرانے زمانے کا جبکہ اُس دن جو حملہ ہوا تھا اُسے دیکھ کر یہی

لگتا ہے کہ اُس کے پاس تو جدید ترین اسلحہ ہے ہم اُس کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے'' آزاد نے اُسے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

''ہمت تو ہم نے اُس وقت بھی نہیں ہاری تھی جب ہم پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے پاس صرف تین خودکش جیکٹیں تھی تو اب تم کیوں ہمت ہار رہے ہو''۔

''تب کی بات اور تھی یار لیکن اب فوج اُن دہشتگردوں کے خلاف آپریشن شروع کر رہی ہے اور یہ مت بھولو کہ اُن کی نظروں میں ہم بھی

دہشتگرد ہیں اور اُس مولانا کا مقابلہ تو ہم پھر بھی کر لیں گے لیکن اپنی ہی فوج پر گولیاں کیسے چلائیں گے

'' آزاد کی بات سُن کر ایک پل کے لیے وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

''بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں ورنہ موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا'' آزاد نے اُسے خاموش دیکھ کر مشورہ دیا۔

''بے وقوفوں جیسی بات مت کرو آزاد اگر فوج مولانا کے کیمپ تک پہنچ گئی تو وہ اکبر اُن تمام لڑکوں کو مروا دے گا جنہیں ہم آزاد کروانا چاہتے ہیں''۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ کہ آخر کیا کریں ہم'' اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو آزاد یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہمیں ہر حال میں اُن تمام لڑکوں کو آزادی دلوانی ہے اور اُس کے لیے موت بھی آجائے تو کوئی پرواہ نہیں اس لیے جتنی جلدی ہو سکے حسن اور عائشہ کو یہاں سے روانہ کرو اُس کے بعد ہم کیمپ میں چلے جائیں گے''۔ وہ لوگ اپنے منصوبے بنا رہے تھے اس بات سے بے خبر کے عائشہ گل کھڑکی سے اُن کی تمام باتیں سن رہی تھی۔

☆......☆......☆

''تو یہ تھی اُن تین دہشتگردوں کی کہانی'' میجر صاحب نے تمام قصہ سننے کے بعد کہا۔

''جی سر میری قسمت اچھی تھی کہ اُس دن میں نے اُن سب کی باتیں سن لی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ آپ بھی اسی علاقے میں آپریشن کر رہے ہیں اسی لیے میں نے اپنے شوہر کو ساتھ لیا اور آپ کی تلاش میں نکل پڑی''

”کیا تمھارا شوہر بھی تمھارے ساتھ ہے“ میجر صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”جی سر وہ وہاں پہاڑی کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں“ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو حسن نے سر جھکا کر میجر صاحب کو سلام کیا۔

”بی بی جو کچھ بھی اُن لڑکوں کے ساتھ ہوا مجھے اُس کا بے حد افسوس ہے لیکن میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں“۔

”سر آپ کو یہ کہانی سنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اُن سب کی جان بچانا چاہتی ہوں...... میں جانتی ہوں کہ اُس مولانا کو مارنے کہ لیے اُن کے پاس حوصلہ بہت ہے لیکن ہتھیار نہیں کیونکہ اُس مولانا کو بیرونی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے جو اُسے جدید ترین اصلحہ فراہم کرتے ہیں“ اُس نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

”جہاں تک بات اُس مولانا کی ہے تو وہ لوگ ہمیں صرف اُس غدار کا پتا بتا دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم مولانا اور اُس کے پورے گروہ کو نیست و نابود کر دیں گے اور رہی بات اُن تینوں کی تو بہتر یہ ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں اس صورت میں اُن کی جان بخشی ہو جائے گی“۔

”سر خدا کے لیے آپ اُن تینوں کو معاف کر دیں جو کچھ اُنھیں نے کیا ہے وہ اُس کی بہت بڑی سزا بھگت چکے ہیں“ اُس نے میجر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بی بی میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن وہ پاکستان کے قانون کے مطابق گنہگار ہیں اور اس جرم کی سزا اُنھیں مل کہ ہی رہے گی“۔

”کونسے قانون کی بات کر رہے ہیں اُس ملک کے قانون کی جہاں کہ ہر سیاستدان پر کرپشن بے گناہوں کے قتل سمیت سینکڑوں کیس ہیں اور وہ کبھی اُن گناہوں کا اقرار بھی نہیں کرتے لیکن وہ پھر بھی آزاد گھوم رہے ہیں اور یہ لوگ اپنے گناہ کی توبہ کر چکے ہیں اور اب اپنی غلطیوں کا مداوہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ اُنھیں قید کرنا چاہتے ہیں“۔

”میں آپ کی بات سمجھتا ہوں لیکن......“۔

”سر میں تو اس لیے آپ کے پاس آئی تھی کہ آپ لوگ اُن غداروں کو ختم کرنے میں اور معصوم لڑکوں کو بچانے میں اُن تینوں کی مدد کریں گے لیکن آپ تو اُنھیں قید کرنے پر تلے ہوئے ہیں“۔

”میں مجبور ہوں اور میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا“ میجر صاحب نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے سر آپ قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے لیکن کچھ مہلت تو دے سکتے ہیں“۔

”کیا مطلب......؟“ میجر صاحب کو اُس کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”سر وہ لوگ پاک فوج کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن اُس مولانا کہ بارے میں وہ کبھی بھی آپ کو نہیں بتائے گے کیونکہ جو کچھ اُس نے اُن تینوں کے ساتھ کیا ہے اُس کے بعد وہ اُسے خود اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتے ہیں اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ مولانا کی موت تک اُن تینوں کا ساتھ اُس کے بعد آپ چاہیں تو اُنھیں جان سے ماردیں یا پھر قید کرلیں“ اُس نے جب دیکھا کہ میجر صاحب بضد ہیں تو اُس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کہوں“ میجر صاحب کو فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے سر آپ کی مرضی اگر آپ مدد نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں وہ لوگ موت سے نہیں ڈرتے وہ اُس مولانا کا کرلیں گے جو کرنا ہے“ اُس نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں“ بالآخر اُنھوں نے فیصلہ کر ہی لیا۔

”شکریہ سر...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں“۔

”میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم آپ کی مشکور ہوگی کیونکہ آپ کی وجہ سے بہت جلد دہشتگردوں کا بہت بڑا گروہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا“۔

”انشاءاللہ“۔

”فجر کی آزان ہونے والی ہے ابھی آپ لوگ جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے اُن کو لے کر یہاں آ جاؤ پھر ہم اُن کے ساتھ مل کر اپنی حکمت عملی تیار کریں گے“۔

''بہت شکریہ سر میں آج ہی اُن کو لے کر یہاں آجاؤں گی''۔

''رُکیے بی بی'' وہ مڑ کر جانے لگی تو میجر صاحب نے آواز دی''۔

''بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی تم جیسی بہن یا بیٹی ہوتی ہے''۔

اُس نے تشکر بھری نظروں سے میجر صاحب کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

''یار ہر جگہ ڈھونڈ لیا لیکن وہ دونوں کہیں بھی نہیں ملے'' عمر بُری طرح ہانپ رہا تھا ۔

''سمجھ نہیں آرہی کہ آخر وہ جا کہاں سکتے ہیں'' آزاد نے اپنے ہاتھ سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

''کہیں اُس مولانا یا اُس کے آدمیوں نے اُنھیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو'' عمر کو خدشہ ہوا۔

''یار اُس کے پاس تو کوئی موبائل بھی نہیں ہے ہم رابطہ بھی نہیں کر سکتے''۔

''ہاتھ پر ہاتھ رکھ کہ بھی تو نہیں بیٹھ سکتے اور ویسے بھی جب تک وہ دونوں مل نہیں جاتے میرے بے قرار دل کو چین نہیں ملے گا'' عمر کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''پریشان مت ہو ایسا کرتے ہیں پہاڑوں کی طرف چلتے ہیں ہو سکتا ہے کہ صبح صبح وہ وہیں گئے ہوں'' آزاد نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں چلو......'' جیسے ہی وہ پہاڑ کی طرف جانے لگے تو اُن دونوں کو سامنے سے آتا دیکھ کر رُک گئے۔

''اللہ کا شکر ہے یار تم دونوں آگئے تمھاری تلاش میں تو ہماری جان ہی نکل گئی تھی'' عمر نے بھاگ کر حسن کو گلے لگا لیا۔

''حد ہوتی ہے یار حسن تجھے پتا بھی ہے کہ ہماری جان کو خطرہ لاحق ہے اور تم دونوں سیر سپاٹے میں لگے ہوئے ہو اگر تم دونوں کو کچھ ہو جاتا تو'' آزاد نے قدرے بے رُخی سے سوال کیا۔

''عمر ہم سیر سپاٹے کو نہیں گئے تھے'' حسن نے بھی اُسی انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر اتنی صبح سے کہاں غائب ہو تھے تم لوگ'' عمر نے سوالیہ نگاہوں سے اُن دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہم تو رات کے نکلے ہوئے تھے''۔

”ایسی بھی کیا مصیبت آن پڑی تھی جو تم لوگوں نے سورج طلوع ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا“ عائشہ گل کی بات سُن کر عمر کو مزید غصہ آ گیا تھا۔

”لالا ہم آپ لوگوں کے لیے مدد مانگنے گئے تھے“ عائشہ گل نے بات کی وضاحت کی۔

”مدد......کس سے“ آزاد نے حیرت بھری نگاہوں سے عائشہ گل کی طرف دیکھا۔

”پاکستان آرمی سے“۔

”کیا تم لوگوں نے آرمی والوں کو ہمارے بارے میں بتا دیا“ اُس کی بات سُن کر عمر کے ہوش اُڑ گئے تھے۔

”ہاں لالا اور میجر صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کی مدد ضرور کریں گے“۔

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو“ اُسے عائشہ گل کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں لالا میجر صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ سب کو لے کر آج ہی اُن کے پاس پہنچ جاؤں تا کہ وہ آپ کے ساتھ مل کر اُن دہشتگردوں کے خلاف حکمت عملی تیار کر سکیں“۔

”چلو اللہ کا شکر ہے یار کہ یہ مسئلہ تو حل ہو گیا ہے لیکن تم کو کیسے پتا چلا کہ ہمیں مدد کی ضرورت ہے“ آزاد کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

”کیونکہ عائشہ گل نے تم لوگوں کی ہونے والی گفتگو سُن لی تھی اور پھر اُس نے یہ سب مجھے بتا دیا تھا اور کیونکہ ہم دونوں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے اس لیے ہم نے تمھارے لیے مدد کا انتظام کر لیا“ اُس نے اپنا ہاتھ عمر کے کندھے پر رکھا۔

”لیکن جانا تو تمھیں اب بھی پڑے گا“ اُس نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عمر“۔

”جو کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں تم دونوں کو یہاں سے جانا ہی ہوگا“ عمر اب بھی بضد تھا۔

”لیکن کیوں یار......“

”کیونکہ اب تمھاری شادی ہو چکی ہے اور میں چاہتا ہوں کے تم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ پرسکون زندگی گزارو اور وہ یہاں ممکن نہیں“۔

"یار عمر مجھے تجھ سے اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ موت ایک حقیقت ہے اور ہم کہیں بھی چلے جائیں اُس سے بچ نہیں سکتے اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اسلام آباد میں چلے جائیں تو وہاں ہمیں کچھ نہیں ہوگا"۔

"اور ہاں لالا میں بھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی"۔

"دیکھو گل میں بھی تم لوگوں کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتا لیکن میں پہلے ہی اپنا سب کچھ کھو چکا ہوں اور اب مجھ میں تم دونوں کو کھونے کی ہمت نہیں ہے" اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بند کرو یار اپنی بکواس جو رات قبر میں ہے اور باہر کبھی نہیں گزر سکتی اس لیے اب ہم میں سے کوئی بھی کسی کو چھوڑ کر نہیں جائے گا جیئے گے تو ایک ساتھ اور مریں گے تو بھی ایک ساتھ" اُس نے ایک ہاتھ عمر کے کندھے پر رکھا اور ایک آزاد کے کندھے پر۔

"عمر میرے خیال سے یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور ویسے بھی یہ لوگ ہم سے دور رہیں گے تو ہمیں فکر ہی لگی رہے گی" آزاد کو حسن کی بات سمجھ آگئی تھی۔

"یہاں رہے تو شاید مر جائیں گے لیکن تم سے دور ہوئے تو تمھاری فکر میں یقیناً مر جائیں گے" حسن نے اُسے جذبات میں بہانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے پھر تیاری کرو میجر صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہونگے" عمر نے بھی اُس کی دلیلوں کے سامنے ہار مان لی۔

☆......☆......☆

"میجر صاحب آپ صبح سے اُن پہاڑوں کی طرف کیوں دیکھے جا رہے ہیں کیا کسی کا انتظار ہے" زوہیب سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

"ہاں اُس لڑکی کا جو کل رات کو آئی تھی" میجر صاحب اپنی آنکھیں دوربین سے لگائے جواب دیا۔

"میجر صاحب کون تھی وہ لڑکی اور وہ کیوں آپ سے ملنے آرہی ہے" حسن سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

"وہ مجھ سے اپنے بھائی اور شوہر کو ملوانا چاہتی ہے"۔

''ش......شوہر'' اُس نے ایک پل کو ٹھہرتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ اُس کے شوہر کو آپ سے کیا کام'' میجر صاحب نے ایک پل کو نظر دوربین سے ہٹائی اور پھر دوربین سے دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔۔

''وہ دہشتگردوں کے ایک بہت بڑے نیٹ ورک کہ بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں زوہیب دعا کرو کہ وہ جلدی آ جائیں'' میجر صاحب سے ایک پل کا انتظار بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''تو اسی لیے آپ نے ابھی تک کوئی حکمت عملی نہیں بنائی''۔

''ہاں مجھے اُنھی لوگوں کا انتظار ہے جیسے ہی وہ یہاں آتے ہیں پھر ہم اُن سے مل کر ہی آگے کی حکمت عملی طے کریں گے''۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے سر لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لڑکی دوبارہ یہاں آئے گی''۔

ہاں مجھے اُس لڑکی پر پورا یقین ہے کہ وہ اُن سب کو یہاں لے کر ضرور آئے گی''۔

''میجر صاحب آپ جا کر آرام کریں اور یہ دوربین مجھے دے دیں جب وہ آئیں گے تو میں آپ کو اطلاع کر دوں گا''۔

''اُس کی ضرورت نہیں لگتا ہے کہ وہ لوگ آ رہے ہیں'' میجر صاحب نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمارا انتظار ختم ہونے والا ہے زوہیب بس یہ سمجھ لو کہ جتنا یہ لوگ ہم سے دور ہیں اُتنے ہی ہم دہشتگردوں سے دور ہیں''۔

☆......☆......☆

السلام وعلیکم میجر صاحب یہ حسن ہے میرے شوہر اور یہ میرے بھائی ہیں عمر اور آزاد......اور یہ میجر خالد صاحب ہیں'' عائشہ گل نے اُن سب کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی تمھارے ساتھ ہوا مجھے اُس کا بہت افسوس ہے لیکن مجھے بہت خوشی ہوئی یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی''۔

''اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہماری اصلاح فرمائی ورنہ ہم تو......'' حسن نے آسمان کی

طرف دیکھ کر کہا۔
''جو ہونا تھا وہ ہو گیا نوجوان بھول جاؤ وہ سب''۔
''میجر صاحب ہماری مدد کرنے کیلیے بہت شکریہ'' عمر نے تشکر بھری نگاہوں سے میجر صاحب کی دیکھا۔
''پاکستان کی خفاظت ہمارا اولین فریضہ ہے اور اُس مولانا جیسے بھیڑیے پاکستان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں اس لیے اُسے موت کے گھاٹ اُتارنا بہت ضروری ہے اور انشا اللہ وہ دن دور نہیں جب ہم اُس کی اور اُس کے پورے گروہ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے''۔
''لیکن اُس سے پہلے ہمیں اُس کے کیمپ جانا ہو گا جو کہ یہاں سے کچھ دور ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں مولانا ہم جیسے نوجوانوں کو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ کرواتا ہے'' عمر نے اپنا اصل مقصد بیان کیا۔
''بی بی آپ اُس خیمے میں جا کر آرام کریں اور تم لوگ چلو پہلے میرے یونٹ کے باقی جوانوں سے مل لو'' میجر صاحب اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔
''یہ ہے میری یونٹ کے شیر کیپٹن زوہیب کیپٹن صہیب اور کیپٹن سکھوندر''
''سردار اور پاکستانی فوج میں'' عمر کو اُسے فوج میں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔
''اوہ بھائی جب پاکستانی عوام سانوں اپنے دل وچ جگہ دے سکدی اے تے فیر فوج وچ کیوں نہیں'' اُس نے فخریہ انداز میں کہا۔
''ویری ویل سیڈ سکھوندر'' میجر صاحب نے بھی اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
''میجر صاحب یہ لوگ کون ہیں'' کیپٹن صہیب نے پوچھا۔
''یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارے دوست ہیں اور اب سے یہ دہشتگردوں کے خلاف جنگ میں ہمارے ساتھی ہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو ان کی مدد سے ہم دہشتگردوں کے بہت بڑے نیٹ ورک کو تباہ کر دیں گے''۔
''لیکن یہ لوگ دہشتگردوں کے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہیں''۔
''کیونکہ یہ تینوں پورے دوسال اُن کی قید میں رہ چکے ہیں اور اب دوسال بعد اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے ہیں'' میجر صاحب نے اُنھیں اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا۔

''تو بتائیے کیا جانتے ہیں آپ دہشتگردوں کے بارے میں......''۔
''اس علاقے میں دہشتگردوں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک ہے اور اُسے مولانا الیاس نامی شخص آپریٹ کرتا ہے اور اُسے بیرونی طاقتوں کا تعاون حاصل ہے'' عمر نے اُنھیں تفصیلات سے آگاہ کیا۔
''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اُسے بیرونی طاقتوں کا تعاون ہے'' ذوہیب کو تشویش ہوئی۔
''وہ اس لیے کیونکہ اُس کے پاس جدید ہتھیار اور بہت سی دوسری مشینری ہے جو کہ اُس نے اپنے ہیڈکوارٹر پر رکھی ہوئی ہیں''۔
''کہاں ہے اُس کا ہیڈکوارٹر''۔
اُس کے بہت سے ٹھکانے ہیں لیکن مین مرکز یہاں سے کچھ دور پہاڑوں کے درمیان ایک کیمپ کی شکل میں ہے جہاں اکبر نامی شخص نوجوانون کی ٹریننگ کرتا ہے اور اُنھیں بندوق سے لے کر بم چلانے کی تربیت دیتا ہے''۔
''اور جب وہ لوگ اُن کے بارے میں کافی کچھ جان جاتے ہیں تو اُن سے خودکش حملے کرواتا ہے تاکہ اُس کا کام بھی ہو جائے اور اُسے کوئی خطرہ بھی نہ ہو'' آزاد نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔
''کتنے سالوں سے وہ گروہ چلا رہا ہے'' میجر صاحب نے بھی اپنا سوال داغا۔
''یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے لیکن شاید جب سے پاکستان میں دہشتگردی شروع ہوئی ہے''۔
''عجیب بات ہے ان دس سالوں میں کوئی بھی اُسے پکڑ نہیں پایا'' میجر صاحب کو اُس کی بات سُن کر زور کا جھٹکا لگا تھا۔
''آپ کو سُن کر افسوس ہو گا لیکن بیرونی طاقتوں کے ساتھ ساتھ کچھ اندرونی طاقتیں بھی اُس کے ساتھ ہیں'' عمر مزید حیرت کے وار کیے جا رہا تھا۔
''تو پھر کیا پلان ہے تمھارے خیال سے ہمیں کیا کرنا چاہیے''۔
''سر سب سے پہلے ہمیں اُس کے کیمپ میں گھس کر اُن لڑکوں کو وہاں سے آزاد کروانا ہو گا جو جنت کی چاہت میں اُس مولانا کے چنگل میں پھنس چکے ہیں'' عمر نے جواب دیا۔

جی سر وہ لڑکے ہی اُس مولانا کے سب سے بڑے ہتھیار اور طاقت ہیں اگر ہم نے اُنھیں آزاد کر دیا تو اُس کی قمر ٹوٹ جائے گی اور پھر وہ کمزور ہو جائے گا" حسن نے بھی اُس کی بات کی حمایت کی۔

"تو پھر انتظار کس بات کا ہے ہم کل ہی اُس کے کیمپ پر ہلہ بول دیتے ہیں" میجر صاحب مزید دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"سر میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ کیمپ کے اندر فوج ہمارے ساتھ نہیں جائے گی کیونکہ ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو دیکھ کر وہ ڈر جائیں اور فائرنگ کر دیں جس سے بہت سے معصوم مارے جاسکتے ہیں، اس لیے جب تک ہم گولی چلا کر کوئی سگنل نہ دیں آپ لوگ اندر نہیں آئیں گے" عمر نے میجر صاحب سے درخواست کی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تمھیں کیا لگتا ہے کہ وہ لڑکے اتنی آسانی سے تمھاری بات مان جائیں گے"۔

"نہیں سر میں جانتا ہوں کہ وہ ہمارے بات نہیں مانیں گے لیکن جب ہم اُنھیں یہ ریکارڈنگ سنائیں گے تو اُنھیں ہماری بات کا یقین آ ہی جائے گا" آزاد نے وہ ریکارڈنگ چلا دی اور سب خاموشی سے سننے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

"کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے میری بیٹی......" جنت کی ماما کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کھڑکی کے ساتھ کندھا ٹکائے سوچوں کے بھنور میں کھوئی ہوئی تھی۔

"ارے ماما آپ......کیسی ہیں آپ......"؟ اُس نے اُنھیں گلے سے لیا۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم کہاں رہتی ہو آجکل نہ تم ہم سے ملنے آتی ہو نہ کوئی فون کرتی ہو" اُنھوں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ماما بس تھوڑی سی طبیعت خراب تھی اس لیے نہیں آسکی"۔

"کیا ہوا طبیعت کو تم ٹھیک تو ہے" اُنھوں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ لگا کر ٹمپریچر چیک کیا۔

"ماما کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی مر گیا ہو اور پھر اچانک سے واپس آ جائے" اُس کے ذہن میں ابھی تک وہی بات اٹکی ہوئی تھی۔

”یہ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو تم بھلا مر کہ بھی کوئی واپس آ سکتا ہے“۔
”نہیں میرا مطلب ہے کہ اگر کچھ عرصہ پہلے آپ کو خبر ملے کہ وہ مر چکا ہے اور پھر اچانک وہ آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے“۔
”یہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہو تم...... کہیں تم......“ اُنھیں شبہ ہوا۔
”ہاں ماما میں نے عمر کو دیکھا ہے زندہ ہے وہ......“ بالآخر اُس نے بتا ہی دیا تھا۔
”یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹا عمر مر چکا ہے تمھیں کوئی وہم ہوا ہوگا“ اُنھیں جنت کی بات پر یقین نہیں آیا۔
”نہیں ماما وہ عمر ہی تھا“۔
”یہ کیسے ہو سکتا ہے اگر وہ زندہ ہے تو کہاں تھا اب تک اور گھر کیوں نہیں آیا“۔
”یہ سوال تو میں نے بھی پوچھا تھا اُس سے لیکن......“۔
”کیا تم ملی تھی اُس سے......“ اُنھوں نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”جی ماما“ اُس نے اثبات میں جواب دیا۔
”جنت تم اتنی بڑی بیوقوفی کیسے کر سکتی ہو تم کیسے بھول سکتی ہو کہ تمھاری شادی ہو چکی ہے اور تم اس طرح منہ اُٹھا کر ایک غیر شخص سے ملنے چلی گئی“۔
”وہ میرے لیے غیر نہیں ہے ماما“۔
”غیر ہی ہے اب وہ تمھارے لیے یہ مت بھولو کے تم اب اسد کی بیوی ہو“۔
”مجھے صرف اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہیے تھے“۔
”ویسے اس وقت کہاں ہے عمر......؟“
”چلا گیا واپس جہاں سے آیا تھا“۔
”کیا اسد جانتا ہے عمر کے بارے میں؟“۔
”نہیں“۔
”چلو اچھا ہی ہے اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مسئلہ ہونے سے پہلے وہ یہاں سے چلا گیا ابھی تم بھی اُس کی یادوں

کا سوگ منانا چھوڑ و اور نیچے چلو تمھارے پاپا اور اسد نیچے انتظار کر رہے ہیں"۔

☆......☆......☆

"ہم یہاں تک تو آ گئے لیکن اب اندر کیسے جائیں یہاں تو بہت سخت سیکیورٹی ہے" اتنے سخت انتظامات دیکھ کر اُس کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"حوصلہ رکھو اگر اللہ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے تو وہ آگے بھی ہماری مدد کرے گا" آزاد نے حسن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"خبردار......اگر ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اس بندوق سے نکلی گولی تمھارے سر کے آر پار ہوگی" ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کے ایک آدمی نے آزاد کے سر پر بندوق تان لی۔

"سب اپنے ہاتھ اوپر کرو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلو" اُس شخص نے رعب دار آواز میں کہا۔

وہ تینوں آہستہ سے اُٹھے اور اس کے ساتھ چل دیئے اُس شخص نے اُن تینوں کو اکبر کے سامنے پیش کیا۔

"ہم تو کب سے تمھیں ڈھونڈ رہے تھے اور تم لوگ خود ہی موت کے منہ میں آ گئے" اُنھیں اپنے سامنے دیکھ کر اکبر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کیا پتا آج ہماری جگہ تیری موت لکھی ہو" آزاد نے اکبر سے غصیلے لہجے میں کہا۔

"داد دیتا ہوں میں تمھارے حوصلے کی بندوق تمھارے سر پہ ہے اور مجھے مارنے کی بات کر رہے ہو" اکبر نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

اچانک عمر بڑی تیزی سے اُس آدمی کی طرف بڑھا اور اُسے ایک زوردار مکہ رسید کر کے بندوق چھین لی۔

"اب تو موت تمھارے سر پہ کھڑی ہے اب کیا کرو گے" عمر نے بندوق اکبر کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو ایک منٹ کے اندر اندر سب لڑکوں کو میدان میں اکٹھا کرو ورنہ......"۔

"میں کیپٹن اکبر آپ سب لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ آپ سب پانچ منٹ کے اندر اندر باہر میدان میں

آجائیں'' اکبر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے کمرے میں لگے ہوئے ساؤنڈ سسٹم سے اعلان کیا۔

جب سب لڑکے میدان میں اکٹھے ہوگئے تو عمر نے اپنی بندوق کا پچھلا حصہ اکبر کے سر پر دے مارا، اکبر بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا اور وہ تینوں کمرے سے باہر آ گئے۔

''میرے بھائیوں آپ لوگ ہمیں دیکھ کر حیران نہ ہوں ہم بھی کچھ ماہ پہلے تک آپ میں سے ہی تھے لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی اور ہم پر اس مولانا کی اصلیت ظاہر کر دی'' عمر نے گفتگو کا آغاز کیا اور حسن اور آزاد نے اپنی پوزیشن لے لی۔

''اور بے شک اللہ تعالیٰ آپ پر بھی مہربان ہے اسی لیے تو اُس نے ہمیں آپ لوگوں کی اصلاح کے لیے یہاں بھیجا ہے''۔

''آپ لوگ جو جنت کی چاہت میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں لیکن یہ لوگ آپ کو جنت کی طرف نہیں بلکہ جہنم کی طرف لے

کر جا رہے ہیں'' یہ بات سُن کر ہجوم میں ایک شور سا بھرپا ہوا۔

''یہ آپ لوگوں سے اپنے ہی معصوم مسلمان بھائیوں کو قتل کروائیں گے اور پھر جب ان کا مقصد پورا ہو جائے گا تو یہ آپ کو خودکش جیکٹیں دے کر آپ کو کہیں گے کہ وقت آ گیا ہے اب جنت آپ کی منتظر ہے اور پھر آپ لوگ خود کو اپنے ہی ہاتھوں اُڑا دیں گے''۔

''آپ کو ہماری باتوں کا یقین نہیں آ رہا ہوگا تو پھر ٹھیک ہے یہ لیجئے اور اپنے کانوں سے سنیئے اُس مولانا کی اصلیت......'' جب شور کی آواز بڑھنے لگی تو عمر نے مولانا کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سُنائی تاکہ سب کو یقین آ جائے

''یہ شخص مولانا نہیں بلکہ یہ تو کافر ہے اور ہمیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے'' ساری بات سننے کے بعد ہجوم میں سے آواز اُبھری۔

''بہت احمق تھے ہم جو اس کے جھانسے میں آ گئے'' مزید آوازیں بڑھنے لگیں۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا یہ آپ لوگوں کی خوش نصیبی ہے کہ ابھی آپ لوگوں نے اُس کے کہنے پر کوئی گناہ نہیں کیا اس لیے آپ سب اپنے گھر جائیے اور جا کر اپنی زندگیاں نئے سرے سے شروع کریں'' عمر نے اُن کی

حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

’’کاش کہ ہم لوگوں کو بھی آپ کی طرح یہ موقع مل گیا ہوتا تو آج ہم بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ زندگی گزار سکتے‘‘ اُن لوگوں کو دیکھ کر اُس کے اپنے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔

’’مولانا وہ تینوں یہاں آ گئے ہیں اور اُنھوں نے مجھے زخمی کر کے لڑکوں کے سامنے ہماری ساری اصلیت کھول کے رکھ دی ہے‘‘ اکبر نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے مولانا کو فون کیا۔

’’ٹھیک ہے مولانا آپ جلدی جلدی یہاں پہنچ جائیں میں اُن کا مقابلہ کرتا ہوں‘‘ مولانا نے کچھ کہا تو اُس کے جواب میں اکبر نے کہا۔

’’ہم نوجوان غربت اور بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں یہ بھی نہیں سوچتے کے ہمارے بعد ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا‘‘ اکبر باہر آیا تو وہ ابھی تک خطاب کر رہا تھا۔

’’کتنے بیوقوف تھے ہم لوگ جو جہاد کے نام پر اپنے ہی بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے‘‘ مارے شرمندگی کے اُس سے کچھ بولا نہیں گیا۔

’’ہم لوگ جنت کی چاہت میں یہاں آ گئے لیکن یہ بھول گئے کے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ نے ہمیں جنت حاصل کرنے کے کتنے آسان طریقے بتائے ہیں‘‘ عمر کے خاموش ہوتے ہی آزاد نے خطاب شروع کر دیا۔

’’جب ہم لوگ اپنے فرائض پورے کر کہ اپنے ماں باپ کی خدمت کر کے جنت حاصل کر سکتے ہیں تو پھر دہشتگردی کیوں‘‘ حسن سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

’’یہ علماء جو ہم غریبوں کو جہاد کے لیے بھڑکاتے ہیں ان کے اپنے بچے جہاد کیوں نہیں کرتے یا جہاد صرف غریب کے بچوں پر فرض ہے‘‘

آزاد نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔

’’کیا اتنا سب کچھ جاننے کے بعد بھی آپ لوگ ان دہشتگردوں کا ساتھ دیں گے؟ کیا آپ جہاد کے نام پر ہونے والی دہشتگردی کا حصہ بنیں گے؟‘‘ حسن نے ہجوم سے پوچھا۔

''نہیں......'' سب لڑکوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''تو اب سے آپ لوگ آزاد ہیں یہاں سے چلے جائیں اور اپنی زندگیاں دوبارہ شروع کریں'' آزاد نے ابھی یہ کہا ہی تھا کے اکبر نے پیچھے سے گولی چلادی۔

گولی آزاد کے بازو پر لگی اور وہ زخمی ہو کر وہیں گر گیا۔

گولی کی آواز سُن کر وہاں پر بھگدڑ مچ گئی اور منصوبے کے مطابق گولی کی آواز سنتے ہی پاک فوج کے جوان بھی میدان میں اُتر آئے۔

پاک فوج کو اپنے دشمنوں کے ساتھ دیکھ کر اکبر کے اوسان خطا ہو گئے وہ جان بچا کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن پاک فوج کے شکنجے سے آج تک کون بچ سکا ہے۔ چند ہی لمحوں میں اکبر اور اُس کے تمام ساتھی مارے گئے۔

☆......☆......☆

''آزاد............آزاد......اپنی آنکھیں کھول یار'' اُس نے ہلکی سی آنکھیں کھولی تو عمر اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے اُسے پکار رہا تھا عائشہ گل اور حسن اُس کے پاس بیٹھے تھے اور باقی جوان اردگرد کھڑے تھے۔

''اللہ کا شکر ہے...... تجھے ہوش تو آیا'' حسن نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک تو ہے'' عمر کو اب بھی تسلی نہیں ہوئی۔

''میں......ٹھیک ہوں......اکبر اور اُن لڑکوں کا کیا ہوا'' اُس نے ہوش میں آتے ہی پہلا سوال کیا۔

ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے......اکبر اور اُس کے تمام ساتھی مارے گئے اور وہ تمام لڑکے وہاں سے نکل کر اپنے گھروں میں جا چکے ہیں'' عمر نے اُسے خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔

''ہاں عمر سچ کہہ رہا ہے تم لوگوں نے بہت بہادری کا کام کیا ہے بغیر کسی ہتھیار کے اُس کے قلعے میں گُھس کر وہاں سے اتنے سارے لڑکوں کو آزاد کروایا تم لوگوں نے جو کچھ کیا وہ واقعی قابل تعریف ہے''۔

''واقعی اگر وہ لڑکے تیار ہو جاتے اور دہشتگرد بن جاتے تو پتا نہیں کتنی تباہی مچا سکتے تھے'' کیپٹن زوہیب نے

بھی میجر صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمارے گناہوں کا کچھ تو ازالہ ہوا......'' حسن نے سجدہ شکر بجالاتے ہوئے کہا۔
''لیکن وہ مولانا اب بھی باقی ہے'' آزاد نے اُسے یاد کروانے کی کوشش کی۔
''اس وقت تمھیں آرام کی ضرورت ہے جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ہم اُس مولانا کو بھی دیکھ لیں گے'' عمر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے ابھی تم آرام کرو ہم چلتے ہیں''۔
''ٹھیک ہے'' آزاد نے اپنی آنکھیں بند کر لی اور باقی سب باہر آ گئے۔
''آزاد ٹھیک کہہ رہا ہے سر جب تک مولانا زندہ ہے ہم سکون سے نہیں بیٹھ سکتے''۔
''سکون تو ہمیں تب تک نہیں ملے گا جب تک اس ملک میں ایک بھی دہشتگرد زندہ ہے''۔
''تو پھر انتظار کس بات کا ہے اس سے پہلے کے وہ مولانا فرار کی کوئی راہ تلاش کرے ہمیں اُسے بھی دبوچ لینا چاہیے'' کیپٹن زوہیب نے جوشیلے انداز میں کہا۔
''میرے خیال سے زوہیب ٹھیک کہہ رہا ہے'' کیپٹن صہیب نے بھی کیپٹن زوہیب کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔
''میجر صاحب......ہو سکدا اے کہ اوہ پہلاں دی اُڈھاری مار گیا ہووے'' کیپٹن سکھوندر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
''نہیں سر مولانا وہاں پر کئی سالوں سے آباد ہے اور اُسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم اُس جگہ کے بارے میں نہیں جانتے اس لیے میرے خیال سے اُس مولانا کے مطابق اُسے وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا''۔
''اب وہ وہاں ہے یا نہیں یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا'' میجر صاحب نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔
جی سر......آپ بالکل ٹھیک کہہ...........گل کہاں جا رہی ہو'' وہ میجر صاحب سے بات کر رہا تھا کہ اُس کی نظر عائشہ گل پر پڑی۔
''لالا نیچے نہر پر جا رہی ہوں پانی لینے......'' اُس نے نیچے نہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ برتن ان دونوں کو دے دیں یہ دونوں جوان پانی لے آئیں گے'' میجر صاحب نے اپنے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''مدد کے لیے شکریہ سر لیکن میں اپنا کام خود کرتی ہوں......''۔

''گل ضد نہ کرو''۔

لالا آپ مجھے گل کیوں کہتے ہیں میرا پورا نام کیوں نہیں بلاتے'' اُس نے روندھی سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ عائشہ میری امی کا نام ہے اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اُن کا نام اس طرح پکاروں لیکن اگر تمھیں گل کہنا اچھا نہیں لگتا تو آئندہ پورا نام پکار لیا کروں گا'' اُس نے وضاحت بیان کی۔

''آپ اپنی امی کا نام پکاریں یہ تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا آپ کو جو اچھا لگتا ہے آپ وہی پکاریں اچھا ابھی میں پانی بھرنے چلتی ہوں''۔

''اچھا ٹھیک ہے لیکن اکیلی مت جاؤ کسی کو ساتھ لے جاؤ''۔

''ٹھیک ہے میں جاتا ہوں'' حسن نے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔

''نہیں تم رُکو یہ دونوں چلے جاتے ہیں ابھی تمھاری ضرورت ہے'' میجر صاحب نے اُسے جانے سے منع کیا۔

''میجر صاحب آپ جو سمجھانا چاہتے ہیں عمر کو سمجھا دیں وہ مجھے بتا دے گا''۔

جانے دیں میجر صاحب یہ نہیں رُکنے والا ٹھیک ہے جاؤ لیکن تم دونوں اپنا خیال رکھنا''۔

''ٹھیک ہے......'' حسن اور عائشہ گل نیچے نہر کی طرف چلے گئے اور وہ سب باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنی پلاننگ شروع کی۔

''یہ رہا اُس جگہ کا نقشہ جہاں وہ مولانا چھپا ہوا ہے'' اُس نے ایک کاغذ میز پر بچھاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمھیں پورا یقین ہے اُس مولانا کہ ٹھکانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا تم نے بنایا ہے'' میجر صاحب نے پورا یقین کرنے کی کوشش کی۔

''سر میں اُس کے ساتھ دو سال رہا ہوں اُس جگہ کا راستہ میرے لیے نیا ہو سکتا ہے لیکن وہ جگہ نہیں''۔

''اچھا یہ اُس بستی کا نقشہ ہے اور یہ مسجد ہے اور مسجد کے ساتھ مولانا کا گھر......'' وہ سب کو سمجھا رہا تھا اور سب خاموشی سے کھڑے سُن رہے تھے۔

''اگر ہم کسی طرح اس جگہ پہنچ جائیں تو پھر وہ مولانا ہمارے ہاتھ سے بچ کہ نہیں جا............'' گولی کی آواز سنتے ہی رک گیا تھا۔

''یہ آواز پہاڑی کے نیچے سے آئی ہے'' میجر صاحب نے سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''وہ دونوں بھی تو ......'' یہ کہتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا اور سارے جوان بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

پہاڑی سے نیچے تیزی سے اُترنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ بغیر کچھ دیکھے بھاگا جا رہا تھا ایک دو بار گرا بھی لیکن اس وقت اُسے کسی چیز کی ہوش نہیں تھی۔

☆......☆......☆

''لو جی پہنچ گئے نہر پر اب جلدی سے پانی بھر لیں اور واپس چلیں'' اُس نے نہر کے کنارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ دیر بیٹھتے ہیں میں تو پہاڑی سے نیچے اُترنے میں ہی تھک گئی ہوں'' عائشہ گل بھی اُس کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

''نہیں عائشہ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے میں پانی بھرتا ہوں پھر چلتے ہیں''۔

''کیوں تمھیں ڈر لگتا ہے'' اُس نے اُسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ڈر لگتا ہے لیکن اپنے لیے نہیں تمھارے لیے......'' اُس نے شوخی بھرے انداز میں کہا۔

''مجھے تو ڈر نہیں لگتا......'' گل نے شوخ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب سے تمھیں ڈر لگنے گا'' اس سے پہلے کہ حسن کوئی جواب دیتا کسی تیسرے کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تم......تم یہاں کیسے......'' مولانا کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔

''میں تو ترس گیا تھا تم لوگوں کا چہرہ دیکھنے کے لیے......ارے واہ......تم نے شادی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں'' مولانا نے طنزیہ تیر برساتے ہوئے کہا۔

''تمھاری دشمنی میرے ساتھ ہے جو کہنا ہے مجھ سے کہو'' حسن نے جوشیلے انداز میں جواب دیا۔

''میں یہاں تمھیں کچھ کہنے نہیں بلکہ تمھاری کھال اُتارنے آیا ہوں'' مولانا نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''تو پھر انتظار کس کا ہے کھال اُتارنا شروع کرو......'' حسن نے اُسے چڑایا۔

''حسن کون ہے یہ'' عائشہ گل نے حقارت بھری نگاہوں سے مولانا کی طرف دیکھا۔

''یہی ہے وہ کالی بھیڑ جس کی وجہ سے ہم تینوں دہشتگرد بنے''۔

''میں نے سنا ہے کہ تم تینوں بڑے پکے دوست ہو، بچپن، لڑکپن ساری زندگی ایک ساتھ گزاری ہے اب ایک ساتھ مرنا نہیں چاہو گے''۔

''افسوس مولانا کہ تمھارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا کیونکہ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے''۔

''اگر تم یہاں ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں بھی یہیں ہیں اس لیے اگر آسان موت چاہتے ہو تو بتا دو کہ وہ دونوں کہاں ہے''۔

''جب مرنا ہی ہے تو پھر آسان موت کیا اور مشکل کیا''۔

''میں تو یہاں تم تینوں کو مارنے آیا تھا لیکن اگر تم اُن دونوں کا پتا نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں اب اکیلے ہی مرو'' اُس نے حسن پر بندوق تان لی۔

''نہیں......نہیں ذرا رکو میں اتنی دور سے آیا ہوں اس لیے میں تمھیں اتنی آسان موت تو نہیں دوں گا پہلے میں تمھارے ٹکڑے کروں گا پھر تمھاری بیوی کو تمھاری آنکھوں کے سامنے ماروں گا اور پھر آخر میں تمھاری جان لوں گا''۔

''الیاس میں تجھے......'' وہ اُسے مارنے کے لیے آگے بڑا تو مولانا کے آدمیوں نے اُسے دبوچ لیا۔

''نہیں یار مزہ نہیں آرہا مجھے تمھاری آنکھوں میں خوف دیکھنا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے اپنی زندگی کی

بھیک مانگوتا کہ میرے اس بے قرار دل کوسکون ملے“۔

”افسوس مولانا صاحب آپ کے یہ ارمان پورے ہونے والے نہیں کیونکہ مجھے موت کا کوئی غم نہیں بلکہ شہادت کی خوشی ہوگی اس لیے فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع مت کر اور مار دے مجھے“۔

میرے بچے تجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے لیکن اس لڑکی کی جان کی تو ہے نہ“ اُس نے بندوق عائشہ گل کے سر پر رکھ دی۔

”الیاس......تیری دشمنی میرے ساتھ اُسے جانے دے“۔

”کتنا مزہ آئے گا جب یہ چھوٹی سی گولی اس لڑکی کے سر میں گھس جائے گی“ اُس نے عائشہ گل کے بال کھینچے۔

”خدا کا واسطہ ہے تجھے وہ بے قصور ہے جانے دے اُسے“ اُس نے گڑگڑانے کے سے انداز میں کہا۔

”اب آیا نہ مزہ......“ اُس نے عائشہ گل کو پرے دھکیل دیا اور حسن کی جانب آ گیا۔

”تم تو کہہ رہے تھے کہ میری آنکھوں میں خوف نہیں بلکہ خوشی ہوگی تو پھر یہ کیا ہے“ مولانا نہ اپنے چاقو سے اُس کے رُخسار پر آئے آنسو کو صاف کیا جس سے اُس کے چہرے پر زخم آ گیا۔

”میں نے اُس کے ذرا سے بال کھینچے تو تم کس طرح تڑپ اُٹھے ہو اور اگر میں اُسے جان سے مار دوں تو تیرا کیا ہوگا“۔

”نہیں......نہیں الیاس میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں تم یہی چاہتے ہو کہ میں زندگی کی بھیک مانگوں تو میں تجھ سے اپنی بیوی کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں، تم چاہو تو مجھے مار دو لیکن اُسے چھوڑ دو“۔

”نہیں حسن مجھے بھیک میں ملی زندگی نہیں چاہیے تم میرے لیے خود کو ذلیل نہ کرو“۔

”تجھے پتا ہے وہ اب تک کیوں زندہ تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے گڑگڑاؤ لیکن اب میرے دل کے تمام ارمان پورے ہو گئے ہیں اس لیے......“۔ مولانا نے اپنی بندوق سے گولی داغ دی اور ایک شور کے بعد سناٹا چھا گیا۔

گولی عائشہ گل کے سر میں لگی تھی اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے منہ کے بل گر گئی تھی۔

''عا......عاء ش ا......'' حیرت کے مارے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی اور اُس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

''لگتا ہے بہت پیار تھا تجھے اپنی بیوی سے اس لیے جا تو بھی اُس کے پاس لیکن جانے سے پہلے یہ خط اپنے دوستوں کو دے دینا'' مولانا نے چاقو سے پے در پے وار کر کے اُسے ذخمی کر دیا اور وہ بے بس ہو کر وہیں گر گیا۔

☆......☆......☆

اس وقت وہ اور باقی تمام جوان نہر کے کنارے کھڑے تھے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔عمر نے اردگرد نظر دوڑائی تو اُس کی نظر ایک جھاڑیوں پر پڑی جسے دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی۔

اُس نے جھاڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ہٹایا تو وہاں اُن دونوں کی لاشیں پڑی تھی ،خون آلود جسم دیکھ کر وہ تو ساکن سا ہو گیا تھا لیکن میجر صاحب اور پاک فوج کے جوانوں نے آگے بڑھ کر اُن دونوں کو اُٹھایا اور کفن دفن کا انتظام کیا۔

''سر حسن کی جیب سے یہ خط ملا ہے'' کیپٹن صہیب نے ایک کاغذ کا ٹکڑا میجر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میجر صاحب نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

''اب تک میں حیران تھا کہ کیسے تم لوگ میرے کیمپ تک پہنچ گئے ،جب میں نے اکبر کی موت کی خبر سنی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میرے وہ بچے جنہیں میں نے بندوق چلانا سکھایا وہ اب مجھے ہی مارنے کی تیاری میں ہیں۔تم لوگوں نے خودکش حملہ نہ کر کہ مجھے بہت گہرا زخم دیا اور پھر جابر اور اکبر کو مار کر میرے زخم پر ضرب لگائی ۔لیکن اب تمھارے دوست کی موت سے مجھے راحت مل گئی ہے کیونکہ اب تم بھی وہی درد برداشت کرو گے جو میں کر رہا ہوں ،لیکن میں تمھاری طرح ظالم نہیں ہوں زیادہ دیر تمھیں یہ تکلیف برداشت نہیں کرنے دوں گا کیونکہ بہت جلد میں تمھیں بھی تمھارے دوست کے پاس بھیج دوں گا۔

تمھارا پیارا دشمن الیاس''۔

یہ سنتے ہی عمر آگ بگولا ہو گیا اُس نے بندوق اُٹھائی اور وہاں سے چل دیا۔

”عمر کہاں جارہے ہو؟“ میجر صاحب نے اُس کا بازو تھام لیا۔

”اُس مولانا کی جان لینے“۔

”ہوش کے ناخن لو یہ وقت اسطرح غصے سے کام لینے کا نہیں ہے“۔

”مجھے اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں ہے میجر صاحب اُس نے آج دوسری بار مجھ سے میری فیملی چھینی ہے میں اُسے جان سے ماردوں گا“ وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

”مارنا اُسے ہم بھی چاہتے ہیں لیکن اس طرح نہیں بلکہ پلاننگ کے ساتھ ابھی تم جاؤ گے پتا نہیں وہاں کتنے لوگ ہوں گے کتنا اسلحہ ہوگا اُن کے پاس اس لیے پہلے ہمیں اپنا ہوم ورک کرنا ہوگا پھر اُس کا کام تمام کریں گے“

”میجر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں عمر، حسن صرف تمھارا نہیں بلکہ ہمارا بھی دوست تھا اور عائشہ گل تو ہماری بہنوں جیسی تھی بہت کم وقت میں اُن دونوں نے ہمارے دلوں میں جگہ بنالی تھی اس لیے اُن کا بدلہ تم اکیلے نہیں بلکہ ہم سب مل کرلیں گے“ کیپٹن صہیب نے اُس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

اُن سب کی بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی اُس نے اپنی بندوق نیچے پھینک دی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونے لگا۔

”حوصلہ کرو عمر......شہید ہونے والوں کو رویا نہیں کرتے بلکہ اُن پر تو فخر کیا جاتا ہے“۔

”میں نے کتنا کہا تھا اُن دونوں کو کہ یہاں سے چلے جاؤ لیکن اُنھوں نے میری ایک نہیں مانی“ اُس نے روتے ہوئے کہا۔

”اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کیونکہ اُن کی موت اسی جگہ لکھی تھی تو پھر وہ اسلام آباد کیوں کر جا سکتے تھے“۔

”میں نے قاری صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ میں مرتے دم تک عائشہ گل کی حفاظت کروں گا لیکن میں اپنا فرض پورا نہیں کرسکا اب میں قاری صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا“ اُسے اپنے کیے ہوئے عہد کی بھی فکر تھی۔

”ہر انسان کی موت کا ایک وقت مقرر ہے اور اُس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا اور قاری صاحب بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہونگے اس لیے اب رونا چھوڑو اور اُن کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں اچھی جگہ عطا فرمائے“

میجر صاحب نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اُس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

☆......☆......☆

''جوانوں......انشا اللہ عزوجل کل ہم لوگ اس ملک سے دہشتگردوں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک ختم کرنے جارہے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نیٹ ورک کے ساتھ ہم بھی ختم ہوجائیں'' میجر صاحب نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ خوش نصیب ہونگے سر اگر شہادت ہمارا مقدر بنے''۔

''ہم ستائیس ہیں اور پتہ نہیں وہاں کتنے لوگ ہوں گے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم ستائیس اُن ستائیس سو کے لیے بھی کافی ہوں گے''۔

''میجر صاحب ہم تو اٹھائیس ہیں کیا ہم میں سے کوئی ایک نہیں جارہا'' کیپٹن زوہیب کو میجر صاحب کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''ہاں آزاد ہمارے ساتھ نہیں جارہا کیونکہ وہ پہلے ہی زخمی ہے میں نے ہیڈکوارٹر بات کرلی ہے ابھی کچھ دیر بعد ہمارے خط لے جانے کی لیے گاڑی آرہی ہے وہ آزاد کو بھی اپنے ساتھ ہسپتال لے جائے گی''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میجر صاحب میں آپ سب کے ساتھ جاؤں گا''۔

''آزاد اب تک تم نے ہماری جتنی مدد کی ہے وہ تمھاری سزا کے لیے کافی ہے اب سے تم اپنے نام کی طرح آزاد ہو حکومت نے میری درخواست پر اس ملک کے مطلوبہ ترین دہشتگردوں کی فہرست سے تم تینوں کے نام ختم کردیے گئے ہیں اور اگر ہم اس جنگ سے کامیاب لوٹے تو بہت جلد عمر بھی تمھارے ساتھ ہوگا''۔

''آپ نے جو کچھ بھی کیا اُس کے لیے شکریہ سر لیکن معافی چاہتا ہوں میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا''۔

''پاگل مت بنو آزاد تم زخمی ہو''۔

''یہ زخم تو کچھ نہیں سر لیکن اُس مولانا نے جو ہمارے دلوں پر زخم لگائے ہیں اُن پر مرہم اُس کی موت سے ہی لگے گا''۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اگر مر بھی گئے تو جاتے جاتے بھی اُس کو اپنے ساتھ لے جائیں گے''۔

''میجر صاحب آج تک قسمت نے مجھے کچھ نہیں دیا بس مجھ سے کچھ نہ کچھ چھینتی ہی رہی ہے بچپن میں تھا تو ماں باپ چھین لیے، جوانی میں آیا تو بھائی بھابھی چھین لیے اور پھر میرا سب سے اچھا دوست بھی چھین لیا لیکن آج پہلی بار مجھے قسمت سے کوئی اُمید ہوئی ہے کہ وہ مجھے شہادت کا درجہ دے گی تو آپ مجھ سے وہ بھی چھین لینا چاہتے ہیں''۔

''ایسی بات نہیں ہے آزاد میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمھارا ایک ہاتھ زخمی ہے تم کیسے......''

''میجر صاحب میں ایک ہاتھ سے پسٹل چلا سکتا ہوں دستی بم پھینک سکتا ہوں آپ مجھے کوئی ایسی پوزیشن دے دیں''۔

''ٹھیک ہے آزاد اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں تم بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہو''۔

اب ہم اٹھائیس ہیں ہم لوگ سات سات سپاہیوں کی ایک ٹیم بنائے گے سب سے آگے عمر اور اُس کی ٹیم ہوگی کیونکہ وہ راستہ جانتا ہے اُس کے بعد کیپٹن زوہیب پھر میں اور سب سے آخر میں کیپٹن سکھوندر کی ٹیم ہمیں کور کرے گی'' میجر صاحب نے اُن کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

''کون کس کی ٹیم میں ہوگا یہ فیصلہ ہم کل کریں گے فی الحال گاڑی آنے والی اگر آپ لوگ اپنے گھر والوں کو چھٹیاں بھیجنا چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں میں اُنھیں دے دوں گا''۔

''میجر صاحب یہ میں بھی کسی کو چٹھی بھیجنا چاہتا ہوں کیا آپ اسے اس کے پتے پر پہنچا دیں گے'' اُس نے خط میجر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جنت کے نام خط لکھا ہے'' میجر صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو جنت کے بارے میں کیسے'' اب چونکنے کی باری اُس کی تھی۔

''عائشہ گل نے بتایا تھا'' میجر صاحب نے اُس کی حیرت کم کرتے ہوئے کہا۔

''جی سر جنت کے نام ہی لکھا ہے''۔

''لیکن اُس کی تو شادی ہوگئی ہے نا''۔

''میں نے صرف اُس سے معافی مانگنے کے لیے خط لکھا ہے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں قیامت کے روز اُس

کے ہاتھ میرے گریبان پر نہ ہوں‘‘۔

’’ٹھیک ہے فکر نہ کرو یہ خط اپنی صحیح جگہ پہنچ جائے گا‘‘ میجر صاحب نے اُس سے خط لے لیا اور باقی چٹھیوں کے ساتھ رکھ دیا۔

☆......☆......☆

’’جنت بیٹا میں پچھلے کچھ دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم اپنی امی سے ناراض ہو نہ تم اُن سے ملنے جاتی ہو نہ اُن کو کوئی فون کرتی ہو بھئی وہ تو مجھ سے گلہ کر رہی تھی کہ میں نے اُس سے اُس کی بیٹی چھین لی ہے‘‘۔

’’نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے ابھی کل ہی میری امی سے فون پر بات ہوئی تھی وہ آپ سے یہ سب اس لیے کہہ رہی ہونگی کیونکہ کافی دن ہو گئے ہیں میں اُن سے ملنے نہیں گئی‘‘۔

’’تو بیٹا چلی جاؤ ظاہری سی بات ہے تم اُن کی اکلوتی اولاد ہو وہ بھی تمھارے لیے اُداس ہو جاتے ہونگے‘‘۔

’’اصل میں امی اسد آجکل کافی مصروف رہتے ہیں بلکہ اتوار کو بھی اُن کی کوئی نہ کوئی بزنس میٹنگ ہوتی ہے اس لیے وقت ہی نہیں ملتا‘‘۔

’’بھئی یہ کیا بات ہوئی اتوار کے روز کون کام پر جاتا ہے بھلا یہ لڑکا تو پاگل ہو جائے گا اس طرح تم اُسے روکتی کیوں نہیں‘‘۔

’’میں تو منع کرتی ہوں لیکن وہ سمجھتے ہی نہیں......‘‘۔

تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اب دیکھو میں کس طرح اُس کی خبر لیتی ہوں‘‘۔

’’باجی یہ کوئی آپ کے لیے دے کر گیا ہے‘‘ ملازمہ نے اُسے خط تھما دیا۔

’’یہ کیا ہے......؟‘‘۔

’’پتا نہیں......‘‘ اُس نے پیکٹ کو بغور دیکھا۔

اُس نے پیکٹ کھول کر دیکھا تو ایک خط تھا۔

’’امی میری دوست کا خط ہے اسلام آباد سے آیا ہے‘‘ اُس نے خط سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

’’یہ کیسی دوست ہے جو اتنے ماڈرن زمانے میں بھی خط لکھتی ہے‘‘۔

”یہ اُس کی پرانی عادت ہے جب بھی کوئی خاص بات کرنی ہوتی ہے تو خط لکھتی ہے“۔

”چلو ٹھیک ہے پھر تم اپنی سہیلی کا خط پڑھ لو میں بھی کافی تھک گئی ہوں کچھ دیر آرام کرلوں“۔

”جی امی......“ اُس نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

”جنت مجھے یقین ہے کہ تم خیریت سے ہو یقیناً تم حیران ہوگی کہ میں نے تمھیں خط کیوں لکھا ہے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف کردو میں کوئی بوجھ لے کر اپنے رب کے حضور نہیں جانا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے لیے یہ سب آسان نہیں تھا تم آج بھی اپنے اُس سوال کا جواب چاہتی ہو جو اُس دن میں نے تمھاری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ میرا یقین کرو میں تو اُس دن گھر واپس آنے کے لیے تیار تھا لیکن پھر ایک ایسا دھما کہ ہوا کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا میرے گمان میں بھی نہیں تھا وہ خبر تم لوگوں تک پہنچ جائے گی اور جب اس بات کا ہوش آیا تو وقت گزر چکا تھا اور میں ایک معصوم انسان سے دہشتگرد بن چکا تھا پھر اس دہشتگردی کی دلدل سے نکلنے کی بجائے میں اُس میں مزید پھنستا چلا گیا میں یہ سمجھتا تھا کہ تم لوگ مجھے بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے گزار رہے ہو گے لیکن جب اُس دن واپس آیا تو پتا چلا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے“

پڑھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

میں بس تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف کردو تا کہ میں بھی مرنے کے بعد اپنی امی بابا دادی اور روحا سے مل سکوں۔ ویسے کتنی عجیب بات ہے نا آج تک زندگی میں صرف دو بار خط لکھا ہے ایک بار پہلے جب لاہور چھوڑ کر جا رہا تھا اور دوسری بار شاید یہ دنیا ہی چھوڑ کر۔ جب تک تمھیں یہ خط ملے گا تب تک شاید میں اس دنیا سے جا چکا ہونگا کیونکہ میں جس راستہ پر جا رہا ہوں وہاں سے زندہ لوٹ آنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ مزید کچھ لکھنے کا حوصلہ نہیں ہے بس اپنا خیال رکھنا میری دل سے دعا ہے کہ اللہ تم دونوں کو دنیا کی تمام خوشیاں نصیب کرے“ اُس کے آنسوؤں سے خط بھیگ چکا تھا۔

”معاف کیا عمر......معاف کیا“ اُس نے خط تکیے پر رکھا اور آنکھیں موند لی۔

☆......☆......☆

”تو آخر کار ہم اُس مولانا کے ٹھکانے پر پہنچ ہی گئے“ کیپٹن زوہیب نے اپنی منزل کو قریب سے دیکھ کر کہا۔

''پہنچ تو گئے ہیں لیکن آس پاس دیکھو کتنے سارے گھر ہیں یقیناً ہر گھر میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا اب پتا نہیں یہ لوگ عام لوگ ہیں یا پھر ان دہشتگردوں کے ساتھی ہیں'' میجر صاحب نے اردگرد نظریں دوڑائی۔

''میرے خیال سے یہ تمام لوگ معصوم ہیں کیونکہ یہ اگر مولانا کے ساتھی ہوتے تو مولانا یوں شریف بننے کا دکھاوا نہ کرتا'' عمر نے اپنی رائے پیش کی۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ مولانا نے ہمیں روکنے کے لیے سخت سیکیورٹی لگائی ہوگی لیکن یہاں تو مکمل خاموشی ہے اور کوئی بھی نظر نہیں آرہا'' آزاد نے بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی سازش ہو یا پھر مولانا یہاں سے بھاگ گیا ہو''۔

''زوہیب تم ایسا کرو کہ اپنی ٹیم کو لے جاؤ اور اگر سب ٹھیک ہو تو ہمیں اشارہ کر دینا'' میجر صاحب نے کیپٹن زوہیب کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

کیپٹن زوہیب نے ہدایت کے مطابق عمل کیا اور سب کچھ دیکھنے کے بعد اشارہ کر دیا۔

''عمر اب تم اپنی ٹیم کو لے کر آگے بڑھو اور دوسری طرف کا کونہ کور کرو'' میجر صاحب نے عمر کو ہدایت دی۔

''وہ بھی میجر صاحب کی ہدایت پر عمل کر چکا تھا اب میجر صاحب کی باری تھی۔

''سکھوندر اب تم اپنی ٹیم کو لے کر پیچھے کی جانب سے جاؤ اور میں سامنے کی طرف سے جاتا ہوں اور یاد رکھو ہم سب ایک ساتھ گھر میں داخل ہوں گے''۔

وہ سب اپنی اپنی پوزیشن لے چکے تھے میجر صاحب کا اشارہ ملتے ہی دونوں نے ایک ساتھ دروازوں کو لات ماری اور دروازے کھل گئے لیکن اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

''میجر صاحب......ایتھے کوئی نہیں لگدا اے کہ مولانا ایتھوں اُڈھاری مار گیا اے'' سکھوندر کا یہ کہنا ہی تھا کہ چاروں طرف سے دہشتگردوں کا سیلاب اُمڈ آیا اور اُنھوں نے پاک فوج پر دھاوا بول دیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

فائرنگ کے نتیجے میں بہت سارے جوان شہید ہو گئے لیکن پاک فوج نے بھرپور جوابی کاروائی کی اور مولانا کہ بھی بہت سارے دہشتگرد مار گرائے۔

''غلطی ہوگئی ہمیں ایک ٹیم پیچھے بیک اپ پر رکھنی چاہیے تھی'' کیپٹن زوہیب نے میجر صاحب کو مخاطب کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو زوہیب میں نے اس مولانا کو بہت آسان ہدف سمجھ لیا'' میجر صاحب نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

''ساڈے بہت سے جوان شہید ہو چکے ہیں میجر صاحب اب ہم صرف چھ ہی زندہ بچے ہیں'' کیپٹن سکھوندر نے اپنی ٹیم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کرو سکھوندر ہم نے بھی تو اُن کے بہت سے دہشتگرد مار دیے ہیں اور جتنے رہ گئے ہیں اگر اللہ نے چاہا تو اُن کے لیے تو صرف تم اکیلے ہی کافی ہو''۔

''میجر صاحب ہم سب اس ایک گھر میں ہی پھنسے ہوئے ہیں اگر اُس مولانا کوئی راکٹ یا بم چلا دیا تو ہم سب کے سب مارے جائیں گے اس لیے ہم میں سے کچھ کو یہاں سے نکل جانا چاہیے''۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمر لیکن باہر نکلے کیسے وہ مسلسل فائرنگ کر رہے ہیں''۔

''اگر ہم لوگ اُن کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہاں سے نکل سکتے ہیں''۔

''تو پھر ٹھیک میں اور زوبیر تمھیں کور کرتے ہیں تم اور سکھوندر نکل جاؤ پھر ہم آزاد اور زوہیب کو کور کریں گے تو وہ دونوں بھی یہاں سے نکل جائیں گے میں اور صہیب یہیں رہ کر اُن پر فائرنگ کریں گے''۔

''نہیں میجر صاحب آپ سب نکل جایئے یہاں سے باہر جا کر آپ اُس مولانا کو آسانی سے مار سکتے ہیں میرے لیے یہ بہترین پوزیشن ہے یہاں سے میں آسانی سے اُن کا شکار کر سکتا ہوں''۔

''آزاد تم نے میری بات نہ ماننے کی قسم کھائی ہوئی ہے''۔

''ضد کرنے کی بچپن کی عادت ہے سر بہت کوشش کی لیکن پیچھا ہی نہیں چھوڑتی''۔

''ٹھیک ہے پھر زوہیب تم بھی آزاد کے ساتھ یہیں رُکو ہم نکلتے ہیں''۔

پہلے عمر اور سکھوندر نے کور ملتے ہی باہر چھلانگ لگا دی اور اُن کے پیچھے میجر اور کیپٹن صہیب بھی میدان میں کود پڑے اور سینہ تان کر دہشتگردوں پر فائر کھول دیا۔ زوہیب اور آزاد ابھی بھی کمرے میں ہی موجود تھے اور

کھڑکیوں سے ہی دہشتگردوں کا مقابلہ کیے جا رہے تھے۔
اُنھوں نے بڑی بہادری سے اُن دہشتگردوں کا مقابلہ کیا اور ایک ہی گھنٹے میں اُنھیں دھول چٹا دی اور اب صرف مولانا اور اُس کے گنے چنے ہی لوگ بچے تھے۔
اچانک کیپٹن صہیب کی نظر ایک دہشتگرد پر پڑی جو راکٹ لانچر چلانے کی تیاری کر رہا تھا اور اُس کا نشانہ اُس کمرے کی طرف تھا جہاں آزاد اور زوہیب تھے، کیپٹن صہیب نے گولی چلانے کی کوشش کی لیکن اُس کی بندوق سے گولیاں ختم ہو چکی تھی۔ بالآخر کیپٹن صہیب نے اُس کمرے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا، اُس کا خیال تھا کہ وہ اُن دونوں کو کمرے سے نکال لے گا لیکن اس سے پہلے کے وہ تینوں کمرے سے باہر نکلتے دہشتگرد نے راکٹ داغ دیا اور وہ تینوں اُس دھماکے کے ساتھ اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔
''آزاد......'' عمر نے دھماکہ کی آواز سنی تو بے اختیار چلا دیا۔
''الیاس تیری تو......'' اُس نے آواز بلند کی اور فائرنگ شروع کر دی لیکن مولانا اور اُس کے بچے کچے ساتھی پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔
''عمر اس طرح گولیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ دیکھو سامنے ایک اُنچا ٹیلا ہے اگر ہم اُس پر چڑھ جائیں تو اُس جگہ سے آسانی سے اُس مولانا اور اُس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر سکتے ہیں''۔
''ٹھیک ہے میجر صاحب میں اُس ٹیلے پر چڑھنے کو کوشش کرتا ہوں'' اُس نے بھی فوراً حکم کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں تم دونوں یہیں رک کر مجھے کور کرنے کی کوشش کرو میں اُس ٹیلے پر جاتا ہوں'' میجر خالد نے بندوق اپنے کندھے پر لٹکائی اور ٹیلے کی طرف چل دیے۔ عمر اور سکھوندر فائرنگ جاری رکھے ہوئے تھے تاکہ دہشتگردوں کا دھیان بٹا رہے اور میجر صاحب ٹیلے پر چڑھنے میں کامیاب ہو جائیں۔
میجر صاحب ٹیلے پر پہنچنے ہی والے تھے کہ اُن دونوں کی گولیاں ختم ہو گئی۔ گولیاں ختم ہونے کی دیر تھی کہ مولانا اور اُسکے ساتھی اپنی بل سے باہر نکل آئے اور سامنے سے فائرنگ شروع کر دی جس سے بچنے کے لیے وہ ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ گئے۔ اچانک مولانا کی نظر میجر صاحب پر پڑھ گئی تو اُس نے اپنی بندوق کا

رُخ میجر صاحب کی طرف کردیا۔ میجر صاحب کی پشت پر آٹھ گولیاں لگی اور اور ٹیلے سے نیچے آن گرے۔ بلندی سے گرنے کی وجہ سے اُن کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ بری طرح ذخمی ہو گئے۔ عمر اور سکھوندر نے میجر صاحب کو ٹیلے سے گرتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار اُن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ابھی وہ وہاں تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ مولانا نے اپنی بندوق سے اُن دونوں کو نشانہ بنایا ایک گولی عمر کی کمر میں لگی اور دوسری سکھوندر کے سر میں لگی اور وہ دونوں نیچے جا گرے۔ سکھوندر تو گولی لگتے ہی شہید ہو گیا لیکن عمر گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا میجر صاحب کی طرف بڑھنے لگا جو کہ اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ مولانا اور اُس کے تمام ساتھی عمر کے گرد جمع ہو گئے۔

''یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گے'' مولانا نے گانا گنگنایا اور عمر کی قمر پر ایک اور گولی دے ماری جو میجر صاحب کی طرف رینگتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔

درد کی شدت سے وہ کچھ سیکنڈ رکا اور پھر سے چل دیا۔

''یہ دیکھو دوستوں ایک دہشتگرد کے دل میں پیار اور وہ بھی پاکستانی فوج کے لیے......اُس آرمی کے لیے جو دن رات ہم جیسے دہشتگردوں کو نیست و نابود کرنے میں لگی رہتی ہے'' مولانا نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا اور ایک اور گولی عمر کی پیٹ پر دے ماری۔

''وہ پھر سے کچھ دیر رکا لیکن بالآخر رینگتے رینگتے میجر صاحب کے قریب آن پہنچا''۔

''واہ میجر صاحب واہ......ہم نے آپ پر چھپ کر وار کیا لیکن پھر بھی آپ کے اٹھائیس جوانوں کے دستے نے میرے دوسو بیاسی ساتھی مار گرائے آپ کی اس بہادری کو سلیوٹ کرنے کا دل کرتا ہے'' اُس نے میجر صاحب کو مخاطب کیا جو دم توڑ چکے تھے۔

''یہ دیکھو میرا پیارا بچہ کیسے چیونٹی کی طرح رینگ رہا ہے'' اب وہ عمر کی طرف متوجہ ہوا۔

''ابے بس کر تو جس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہے وہ کب کا مر چکا ہے'' اُس نے عمر کی کمر پر لات ماری جہاں پہلے ہی گولیوں کے زخم تھے۔

''بالآخر وہ میجر صاحب کے پاس پہنچ ہی گیا وہ جانتا تھا کہ میجر صاحب نے اپنے سینے پر بارود سے بھری ہوئی جیکٹ پہنی ہوئی ہے اُس نے اپنا سر میجر صاحب کے سینے پر رکھ دیا جس کے مدد سے ٹائمر آن ہو گیا۔

''اگر تو ہماری بات مان لیتا تو اُس دن بڑی آسانی سے تیری جان نکل جاتی لیکن اب دیکھ کیسے کتے کی موت مر رہا ہے کیا ملا تجھے یہ سب کر کے'' مولانا نے عمر پر اپنی بندوق تان لی۔

''ج......جن......جنت'' اُس نے اپنی انگلی آسمان کی طرف بلند کی اور اُس کے بعد ایک زوردار دھماکہ ہو گیا۔

دھماکے کے بعد ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا اور ہر جگہ لاشیں ہی لاشیں تھی۔

اس دھماکے میں عمر کے ساتھ مولانا اور اُس کے ساتھی بھی موت کی وادی میں چلے گئے۔

اس طرح اُن تینوں نے اپنی جان دے کر اپنی کی ہوئی غلطی کو سُدھار لیا اور خود کو جہنم کی آگ سے بچالیا لیکن آج بھی بہت سارے نوجوان ایسے ہیں جو جہاد کے نام پر گمراہ ہو کر اپنی دنیا اور آخرت برباد کر رہے ہیں۔ میری تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کے اللہ تعالیٰ اُن نوجوانوں کو ہدایت دے اور دہشتگردوں کو نیست و نابود کر دے تاکہ ہمارے پیارے ملک پاکستان میں امن قائم ہو سکے اور ہم پہلے کی طرح پُرسکون ماحول میں آزادی سے سانس لے سکیں۔ (آمین)

اور میری اس ملک کے سرپرستوں سے درخواست ہے کے وہ بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے خلاف اقدامات کریں کیوں کے بڑھتے ہوئے جرائم کی سب سے بڑی وجہ بیروزگاری ہے انسان کو زندہ رہنے کے لیئے اپنا پیٹ بھرنا پڑتا ہے اور اس پیٹ کو بھرنے کے لیئے وہ ہر بُرے سے بُرا کام کر سکتا ہے۔ اگر بیروزگاری کو ختم کر دیا جائے تو اس ملک سے آدھے جرائم خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

آپ کی دعاؤں کا طلبگار:

حسیب اشرف

......ختم شد......